ہفت روزہ
الفتح
کراچی

۱۰ - ۱۷ فروری
سنہ ۱۹۷۲ء

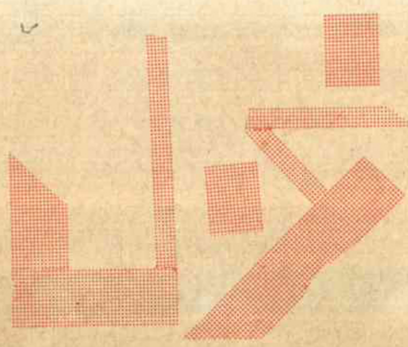
قیمت: ۵۰ پیسے
ہوائی ڈاک: ۵ پیسے

پیکنگ میں پرنس سہانوک سے
نمائندہ الفتح کا خصوصی انٹرویو

چیئرمین ماؤزے تنگ اور چو این لائی نے صدر بھٹو سے کیا کہا؟



پلوں کی تصویر بنانے والے انگریز ڈائریکٹر کو چھوڑ کیوں دیا گیا؟



ان جھیل سی نیلی آنکھوں میں لہرائے کنول کیوں یادوں کے
تو بیتے دنوں میں قید ہے کیوں یہ کام نہیں آزادوں کے

کس خواب کے پیچھے بھاگی تو! کس نگری میں برباد ہوئی!
جو توڑ گئے ہیں دل تیرا کیا نام تھے ان شہزادوں کے

بے موسم تیرے آنگن میں برسات کا موسم کیوں آیا
تو ساتھ کہاں سے لے آئی یہ بادل ساون بھادوں کے

جو ہونا تھا سو ہو بھی چکا گذری ہوئی کل کو بھول بھی جا
چھٹ جائیں گے آہوں کے بادل کٹ جائیں گے دن فریادوں کے

تو روشنیوں کی آس لئے اس بار سمندر پار نہ جا
اپنی ہی تری اس دھرتی سے اُبھریں گے چاند مرادوں کے

یہ امن و امان کی بستی ہے یلغار ہزار کرے کوئی
اتریں گے انہیں کے سینے میں جو خنجر ہیں جلّادوں کے

سو بار قتیل محبّت سے تکتے ہیں در و دیوار ہمیں!
ہم سے ہے نکھار مکانوں کا ہم پتھّر ہیں بنیادوں کے

قتیل شفائی

خدا کی بستی کے مظلوم عوام کا ترجمان

ہفت روزہ
الفتح
کراچی

جلد:۔ ۲ شمارہ:۔ ۳۹

۱۰-۱۷ فروری ۱۹۷۲ء

نگران
شوکت صدیقی
محمود شام

مدیر
ارشاد راؤ

معاونین خصوصی
ابراہیم جلیس، افضل صدیقی، عبدالحمید چھاپرا

مجلس ادارت
وہاب صدیقی - نعیم آروی

آرٹ ایڈیٹر
غلام نبی بزمی

بدلِ اشتراک

	فی پرچہ	سالانہ	ششماہی
	۵۰ پیسے	۲۵ روپے	۱۳ روپے
ہوائی ڈاک سے	۷۵ پیسے	۳۰ روپے	۱۶ روپے

بحرین، کویت :۔ ۶۰ فلس دوبئی قطر: ۷۵ درم
سعودی عرب: ۱۵ قرش۔ انگلستان ۲ شلنگ ۶ پنس

مقام اشاعت
ہفت روزہ الفتح ۸۷ ڈی، نرسری کمرشل ایریا
پی، ای۔ سی۔ ایچ۔ ایس کراچی۔ ۲۹

ٹیلیفون :۔ ۴۱۲۲۷۴

ایڈیٹر پبلشر:۔ ارشاد راؤ
مطبع حقی آفسٹ پریس، لیاقت آباد۔ کراچی

عکاس : الطاف رانا

اداریہ

نامزدگیاں بند کی جائیں

اقتدار سنبھالنے کے بعد ۱۵ فروری کو پہلی بار پاکستان پیپلز پارٹی کی مرکزی کمیٹی کا اجلاس منعقد ہو رہا ہے۔ اگرچہ اس اجلاس کے انعقاد میں دیر ہوئی ہے تاہم چیئرمین پیپلز پارٹی اور صدر مملکت جناب بھٹو کا یہ فیصلہ پارٹی کے اندر جمہوری اقدار کو بلند رکھنے کا عزم رکھنے والوں کے لئے باعثِ مسرت ہے۔

ہمیں یقین ہے کہ اس اجلاس میں بہت سے اہم فیصلے کئے جائیں گے جو ملکی اور غیر ملکی سیاست پر گہرے اثرات مرتب کریں گے۔ ان میں خارجہ اور داخلہ پالیسیاں، تعلیمی اور مزدور پالیسی اور دوسرے امور میں پارٹی کے تنظیمی معاملات شامل ہوں گے۔

ہم اس اجلاس سے قبل سنٹرل کمیٹی کے سامنے اپنا ایک مطالبہ دہرانا چاہتے ہیں اور وہ ہے "حکومتی عہدے الگ، پارٹی عہدے الگ۔" ہم نے یہ آواز صدر بھٹو کے اقتدار سنبھالنے کے فوری بعد بلند کی تھی اور اس وقت ہمارے کانوں میں یہ آوازیں سنائی دے رہی تھیں کہ پاکستان پیپلز پارٹی کو لپیٹ کر اسلام آباد اور چاروں صوبوں کے گورنر ہاؤسوں میں سجا کر رکھ دیا گیا ہے۔ کسی جمہوری پارٹی کے بارے میں اس قسم کا عوامی تأثر انتہائی خطرناک نتائج کو جنم دینے کی پوری صلاحیت رکھتا ہے۔

اس پر پارٹی کی تنظیم سے دل چسپی رکھنے والوں کی تمامتر توقعات معراج محمد خان سے وابستہ تھیں۔ لیکن ان کے بارے میں بھی چند دن کے بعد ایوانِ صدر سے اعلان کر دیا گیا کہ انہیں امورِ عامہ کا صدارتی مشیر کر دیا گیا۔ لوگ حیران تھے کہ وہ شخص جس نے عام انتخابات میں حصہ نہیں لیا اور جیل سے رہائی کے بعد اعلان کیا کہ "ہماری جدوجہد اسمبلی کے باہر رہے گی۔ ہم اسمبلی میں بیٹھنے والوں کا محاسبہ کریں گے۔" اس نے مشیر کا عہدہ کیوں قبول کر لیا۔ اور اس طرح پاکستان پیپلز پارٹی کا فعال ترین حصہ بھی اسلام آباد کی زینت بن گیا۔

پاکستان پیپلز پارٹی نے یقیناً پاکستان کے مزدوروں اور کسانوں کو سیاسی شعور سے ہمکنار کیا ہے۔ یہ بہت بڑی خدمت ہے اور عوام میں اسی کے سہارے اس کی مقبولیت برقرار ہے، لیکن اس کے رہنماؤں نے پارٹی کو مضبوط بنانے کے لئے اتنی ہی غفلت سے کام لیا ہے۔ اس ضمن میں ایسی غلطیاں بھی سرزد ہوئی ہیں جو ناقابلِ معافی ہیں اور پارٹی کے کارکنوں کو اس کا شدید احساس ہے۔ مثلاً ایک نامزد عہدیدار نے دوسرے عارضی نامزد عہدے دار کے بارے میں اپنی پارٹی کے باقی نامزد عہدیداروں میں سے ایک کی رائے کو قبول کرتے ہوئے اسلام آباد سے فیصلہ سنا دیا کہ "اس کو ہٹا دو"، "اس کو بٹھا دو۔" اس کی رکنیت خارج، اس کی رکنیت بحال۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوئی سیاسی جماعت نہیں بلکہ ایک فوجی بھرتی کا دفتر ہے جہاں کوئی جنرل فیصلے صادر کر رہا ہے کہ فلاں سولجر فٹ اور فلاں اَن فٹ قرار دے دیا گیا ہے۔

پاکستان پیپلز پارٹی کی سنٹرل کمیٹی چاہے جو فیصلے کرے لیکن ایک فیصلہ ضرور ہونا چاہیئے کہ آئندہ جس سنٹرل کمیٹی کا اجلاس ہوگا، وہ پارٹی کی منتخب کردہ کمیٹی ہو۔ اس کا ہر رکن انتخاب کا سرٹیفکیٹ لے کر داخل ہو اور اس کے پاس کوئی حکومتی عہدہ نہ ہو۔ اس طرح وہ افراد جو حکومت کا حصہ بن چکے ہیں۔ انہیں سختی سے منع کیا جائے کہ وہ اسلام آباد میں بیٹھ کر لاہور، کراچی، رینالہ خورد

باقی صفحہ ۳۴ پر ملاحظہ فرمائیں

ظاہری خبریں اندرونی کہانیاں

الطاف گوہر گرفتار ہوئے تو اخباری وڈیروں اور سیاسی شعبدہ گروں کے گھروں میں صفِ ماتم بچھ گئی۔ گوہر راتوں رات "شہیدِ صحافت" قرار پائے ان کی گرفتاری آزادیٔ صحافت کا مسئلہ بن گئی۔ ابھی کل کی بات ہے جب ایوب آمریت میں "پاکستان ٹائمز" اور "امروز" پر فوج کے پہرے میں قبضہ کیا گیا تو آزادیٔ صحافت کے علمبردار" اخباری میراثی" بن گئے تھے۔ کسی نے کہا سبحان اللہ! کسی نے کہا واہ! واہ۔ کسی نے مرحبا کا نعرہ بلند کیا اور کسی نے لبیک کہا۔ آج جس آزادیٔ صحافت کا کہرام مچا ہے وہ ہے کہاں۔ صحافت کا وقار اور اس کی آزادی کا جنازہ تو اسی روز نکل گیا تھا جب الطاف گوہر ایسے شخص کو ملک کے پانچ ممتاز اخبارات کا چیف ایڈیٹر مقرر کر دیا گیا۔ جس کا صحافت سے کبھی دُور کا بھی تعلق نہیں رہا۔ کیا پیشۂ صحافت بنیوں کی دوکان ہے۔ جس نے چاہا پنواڑی بن بیٹھا۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر اس طرح الطاف گوہر کو جو سالہاسال تک صحافت کا گلا گھونٹتے رہے۔ پانچ اخبارات کا چیف ایڈیٹر کیوں بنایا گیا۔ ایسا کیوں ہوا؟ کیا یہ صحافت کے نام پر خیانت نہیں ہے؟ سیاسی ریاکاری نہیں ہے؟ بہر حال اس "شہیدِ صحافت" کے جو ماتم گسار ہیں، انہیں نوحہ گری ہی کرنی چاہیئے ؂

عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے اُٹھے ——— (ادارہ)

حکومت کا تختہ اُلٹنے کا خفیہ منصوبہ

الطاف گوہر — ایک اہم کردار

الفتح رپورٹ

روزنامہ "ڈان" اور "حریت" کے چیف ایڈیٹر الطاف گوہر کو ۵ فروری کی صبح مارشل لاء کے ضابطہ ۷۸ کے تحت گرفتار کر لیا گیا۔ ایک سرکاری ترجمان نے اس سلسلے میں بتایا ہے کہ الطاف گوہر کی گرفتاری جن بنیادوں پر عمل میں آئی ہے ان کا تعلق ۱۹۶۹ء کی اسکریننگ میں، سرکاری ملازمت سے برطرف کیے جانے اور اس کے بعد ان کی سرگرمیوں سے ہے۔ سرکاری ترجمان نے ان سرگرمیوں پر کوئی روشنی نہیں ڈالی۔ مگر باخبر ذرائع کا کہنا ہے کہ الطاف گوہر کی ان سرگرمیوں کا تعلق ایک ایسے خطرناک منصوبے سے تھا جس کے تحت ایک سازش کے ذریعے پیپلز پارٹی کی حکومت کو اقتدار سے ہٹا کر ایک ایسے حکمران ٹولے کو ملک پر مسلط کرنا تھا جو روس کا فرمانبردار، بھارت کا حامی اور جمہوریہ چین کا مخالف ہو۔

بتایا گیا ہے کہ یہ خطرناک، منصوبہ جس کا براہ راست تعلق غیر ملکی طاقتوں سے ہے، ستمبر ۱۹۷۰ء میں تیار کیا گیا تھا۔ اس کے تین مرحلے مقرر کیے گئے تھے۔ پہلے مرحلے میں یہ طے کیا گیا تھا کہ انتخابات میں ایسی جماعتوں کو کامیاب بنایا جائے جو اپنے سیاسی پروگرام کے اعتبار سے جمہوریہ چین کی دشمن ہوں۔ لیکن جب ہر کوشش کے باوجود پیپلز پارٹی جس میں چین کے حامی محبِ وطن عناصر کی بڑی تعداد شامل ہے بھاری اکثریت سے مغربی پاکستان میں کامیاب ہو گئی تو منصوبے کے دوسرے مرحلے پر کام شروع کر دیا گیا۔

اس مرحلے پر یہ کوشش کی گئی کہ پیپلز پارٹی کو اقتدارِ مملکت میں حصہ دار نہ بننے دیا جائے۔ لہٰذا ایک سازش کے ذریعے پیپلز پارٹی اور عوامی لیگ کے درمیان اتحاد کے تمام راستے مسدود کر دیئے گئے۔ اس مرحلہ پر یحییٰ خان کو بھی اعتماد میں لیا گیا۔ اور ان کو یہ یقین دلایا گیا کہ اگر وہ عوامی لیگ اور ولی خان کی نیپ کے ساتھ تعاون کریں تو صدرِ مملکت کے عہدے پر وہی فائض رہیں گے۔ چنانچہ اس پروگرام کے تحت جنوری ۱۹۷۱ء میں یحییٰ خان ڈھاکہ گئے اور شیخ مجیب سے ان کی تفصیلی بات چیت ہوئی۔ اس ملاقات میں یحییٰ خان نے شیخ مجیب پر مسلح افواج کے خدشات کا کھل کر اظہار کیا، خدشات یہ تھے کہ قومی آمدنی کے وسائل مرکز کے اختیار میں نہ رہے تو مسلح افواج اپنے اخراجات کے لیے صوبوں کی محتاج بن جائے گی اور یہ صورتِ حال مسلح افواج کے لیے قابلِ قبول نہیں۔ وہ ان اخراجات کی ضمانت چاہتی ہیں اور اس ضمانت کے لیے وہ فوج کے نمائندے کو صدرِ مملکت کے عہدے پر دیکھنا چاہتی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ شیخ مجیب نے ان خدشات کا ازالہ کرتے ہوئے یحییٰ خان کو یقین دلایا تھا کہ افواج کے بجٹ میں ہرگز کوئی ترمیم نہیں کی جائے گی اور صدرِ مملکت یحییٰ خان ہی رہیں گے۔ لیکن اس سلسلے میں شیخ مجیب نے یہ شرط رکھی تھی کہ فی الوقت چھ نکات پر کسی قسم کا اختلاف نہ کیا جائے۔ اس لیے کہ موجودہ حالات اس کی اجازت نہیں دیتے۔ بعد میں حالات کی تبدیلی کے ساتھ اس پر نظرِ ثانی کرنے کی ہر گنجائش موجود ہے۔ چنانچہ اس یقین دہانی سے مطمئن ہو کر یحییٰ خان نے ڈھاکہ میں یہ اعلان کر دیا کہ پاکستان کے آئندہ وزیرِ اعظم شیخ مجیب ہوں گے۔

لیکن یحییٰ خان اس اعلان کے بعد جب راولپنڈی واپس پہنچے تو صورتِ حال میں ایک بڑی تبدیلی پیدا ہو چکی تھی اور وہ تبدیلی تھی امریکی پالیسی میں تبدیلی! کہا جاتا ہے کہ یہ خطرناک منصوبہ جس میں روس اور بھارت کا پورا پورا ہاتھ تھا۔ اسے امریکہ کی تائید بھی حاصل تھی اور وہ تائید اس لیے تھی کہ امریکہ بھی روس کی طرح یہ چاہتا تھا کہ پاکستان کا رشتہ چین سے کٹ جائے اور وہ بھارت کا دست نگر بن جائے۔ اس طرح بھارت ایشیا کی ایک ایسی طاقت بن کر ابھرے جو چین کی بڑھتی ہوئی طاقت کی مدِ مقابل بن سکے لیکن اس کے ساتھ ہی امریکہ یہ بھی چاہتا تھا کہ جنوب مشرقی ایشیا پر اس کا غلبہ رہے مگر عوامی لیگ پر بڑھتے ہوئے بھارتی اثرات اور اس کے توسط سے مشرقی پاکستان میں رُوس کے اثر و رسوخ نے امریکہ کو مخالف کر دیا۔ لہٰذا اسے جنوب مشرقی ایشیا میں خصوصیت کے ساتھ پاکستان کے بارے میں اپنی پالیسی پر نظرِ ثانی کرنی پڑی۔ چنانچہ ان فوجی جرنیلوں کی جانب سے جو امریکہ کے حامی تھے یحییٰ خان پر دباؤ ڈالا گیا کہ اقتدار ہرگز عوامی لیگ کو منتقل نہ کیا جائے بلکہ یہ کوشش کی جائے کہ پیپلز پارٹی کے ساتھ اس کا کسی قسم کا سمجھوتہ نہ ہو سکے۔ اسی پروگرام کے تحت پیپلز پارٹی کے سربراہ ذوالفقار علی بھٹو کو یہ تاثر دیا گیا کہ اگر ان کی جماعت نے سیاسی دباؤ نہ ڈالا تو عوامی لیگ مشرقی پاکستان کو پاکستان سے جدا کر دے گی۔ چنانچہ اس کے نتیجہ میں پیپلز پارٹی اور عوامی لیگ کے درمیان پہلی بار سیاسی تصادم ہوا۔ پیپلز پارٹی اور عوامی لیگ میں کھلم کھلا اختلاف پیدا کرانے کے بعد یحییٰ خان نے سنٹرل انٹلی جنیس بیورو کے سابق سربراہ این اے رضوی کو اس بات پر مامور کیا کہ وہ مشرقی پاکستان میں انتشار اور بے چینی پیدا کرائیں۔ چنانچہ رضوی بڑی تعداد میں ایسے پوسٹر، ہینڈ بل اور پمفلٹ مشرقی پاکستان پہنچاتے جن میں شمالی بنگال کو علیحدہ صوبہ بنانے کا مطالبہ

باقی صفحہ ۳۱ پر ملاحظہ فرمائیں

احوالِ واقعی



بیگم نصرت بھٹو ۔ پاکستانی وفد کے ارکان ۔ چینی دوستوں کے ساتھ

پورے چین میں اپنی منزل پا لینے کی دھن دکھائی دی

پہلے خود کو مضبوط کریں پھر جنگ لڑیں

محمود شام

چین کے حقیقی طور پر کامیاب دورے کو اخبارات، ٹیلیویژن اور ریڈیو کی طرف سے اہمیت نہیں دی جا رہی ہے۔

بہت سے لوگوں کے بقول متحدہ پاکستان کی آخری امید شیخ مجیب الرحمان کی وزارتِ عظمٰے کے دور میں متحدہ پاکستان کے حامیوں کا قتلِ عام ہو رہا ہے۔

پریس کے کالے قوانین کے مصنّف الطاف گوہر کو گرفتار کر کے آزادیٔ صحافت کا ہیرو بنایا جا رہا ہے۔

مارشل لا۔ کو مارشل لا کے طور پر استعمال نہ کرتے ہوئے مارشل لا۔ کی بدنامی کا بوجھ اٹھایا جا رہا ہے۔

برسرِ اقتدار آنے والی پارٹی عدمِ تنظیم کا شکار ہو رہی ہے جبکہ کہ دوسری سیاسی پارٹیاں ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو رہی ہیں۔

چین کے دورے سے ۲۰ فروری کی شام کو واپس آنے کے بعد سے یہ سطریں لکھنے تک کی صورتِ حال کچھ ایسی ہے اور میں نے جو تاثرات محسوس کئے، وہ اوپر کی چند سطروں میں سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔ ہو یہ رہا ہے کہ بچے کھچے پاکستان پر اب دنیا بھر کی نظریں ہیں۔ تمام دشمنوں نے سوچ رکھا ہے کہ وقت یہی ہے۔ اس وقت پاکستان کمزور ہے اسے دبا لیا جائے تو بہتر ہے۔ پاکستان کی سالمیت کے دشمن اس کوشش میں ہیں کہ تمام قوتوں کو مجتمع کر کے پاکستان کو تباہ کرنے کی آخری بھرپور کوششیں کر لی جائیں۔ بعض طاقتیں رجعت پرست سرمایہ دارانہ جاگیردارانہ نظام کو بچانے کے لئے آخری کوششیں کر رہی ہیں۔ وہ خواہ یہ نہ بھی چاہتی ہوں کہ اس سے پاکستان کا بھی خاتمہ ہو جائے۔ مگر اس نظام کو محفوظ رکھنے کا نتیجہ پاکستان کے خاتمے کے سوا کچھ نہ ہو گا۔ ان کوششوں میں غیر ملکی طاقتیں بالخصوص روس، برطانیہ اور اندرونِ ملک ان کے ایجنٹ انتہائی سرگرم ہیں۔ بعض لوگ باقاعدہ سوچ سمجھ کر یہ کردار ادا کر رہے ہیں۔ اور بعض نادانستہ اور لاشعوری طور پر ایسی سازشوں میں ملوث ہیں۔ ان تمام طاقتوں کو فی الحال مارشل لا۔ کی مخالفت کا بہانہ مل گیا ہے۔ موجودہ حکومت بھی نہ جانے مارشل لا۔ کو امرت دھارا کیوں سمجھ بیٹھی ہے۔ کیونکہ مارشل لا۔ بنفسہٖ کہیں استعمال بھی نہیں ہو رہا ہے اور نہ اصلاحات کا زور شور ہے کہ لوگ مارشل لا۔ کے خلاف اٹھنے والی آوازوں کی طرف توجہ نہ دیں۔ ادھر ایک خاموشی ہے۔ دوسری طرف مارشل لا۔ کے خاتمے کے لئے مطالبہ کرنے والے ڈھول بجائے جا رہے ہیں۔ پھر سیاسی سطح پر احتجاج اور ایجی ٹیشن کا جواب پارٹی کے کارکنوں سے دلوانے کی بجائے گورنروں اور وزیروں سے دلوایا جا رہا ہے۔ جس کا مطلب حکومت بمقابلہ سیاست دان یعنی اقتدار پارٹی بمقابلہ پارٹی ہے۔ عوام ذہنی طور پر حکومت اور اقتدار پارٹی سے بیزار ہیں۔ اس لئے اِن کی ہمدردیاں ظاہر ہے کس طرف ہوں گی۔ میرا وجدان خطرات اور خدشات انتہائی سنگین خطرات کا احساس دلا رہا ہے۔ تمام راستے تباہی کی طرف جا رہے ہیں۔ لوگ اپنی معمولی معمولی اور چھوٹی چھوٹی خواہشات کی تکمیل کے لئے بھاگ دوڑ کر رہے ہیں۔ جب کہ ایک بہت بڑی قیامت گزر چکی ہے۔ اور صدمات گزرنے کا خطرہ ہے۔ ایک قیامت کے گذر جانے اور آنے والی قیامتوں کے خوف سے اس گھاٹی میں موجود لوگوں کا تو یہ عالم ہونا چاہیئے تھا کہ ہر شخص آنے والی قیامتوں سے بچنے کے لئے تن من دھن سے تیار ہوتا اور ہر کس و ناکس کی کوشش ہوتی کہ یہ طوفان بخیر و عافیت گزر جائے۔ مگر رونا آتا ہے کہ سب لوگ اپنے چھوٹے چھوٹے دائروں میں مقید اپنے چھوٹے چھوٹے مفادات کی تکمیل کی فکر میں ہیں۔ اور دشمن ایک بھرپور حملے کی تیاری کر رہا ہے۔ اس وقت طریقہ صرف وہی ہے۔ جو چین نے اختیار کیا۔ اس کے علاوہ ہر راستہ تباہی کی طرف جاتا ہے۔

چین کا دورہ

چین پہلے بھی جو کچھ کہتا رہا اور جن چیزوں پر زور دیتا رہا، اب کے بھی اس نے ان ہی چیزوں پہ زور دیا۔ اور پاکستانی وفد کے ارکان کو اپنے مضبوط او رخوش حال ملک کی ایک جھلک بھی دکھا دی کہ قومیں ایسے بنتی ہیں۔ ہمارے وفود جب بھی چین جاتے ہیں تو وہ اتنے خوش اور اتنے متاثر ہو کر آتے ہیں کہ چین چین پکارتے ہیں مگر جب عمل کا وقت آتا ہے تو سب جوش ہوا ہو جاتا ہے۔ پیکنگ ایئرپورٹ سے لے کر پیکنگ کی سڑکوں، ہوٹلوں، دکانوں، گریٹ ہال اور گیسٹ ہاؤس میں ہر جگہ ایک اعتماد، تسکین اور اپنی منزل کو پا لینے کی دھن دکھائی دی۔ پیکنگ برف کی چادر میں لپٹا ہوا تھا۔ ہوا اس خنکی کو جسموں اور مکانوں میں لے کر داخل ہو رہی تھی۔ مگر یہاں کی زندگی رواں دواں تھیں۔ نیلے اور سبز لباس کے علاوہ کوئی لباس نظر نہ پڑتا تھا۔ سُرخ رنگ مقدس رنگ ہے۔ بینروں اور جھنڈوں میں نظر آتا ہے۔ یا ٹوپیوں میں سُرخ ستارے جڑے ہوئے ہیں۔ مرد عورت حقیقی معنوں میں شانہ بشانہ کام کر رہے ہیں۔ جو ذرّہ جس جگہ ہے وہیں آفتاب ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ پاکستان جیسے پس ماندہ ملک کے شہریوں کو چین کے دورے کا موقع دینا ہی بذاتِ خود ایک بہت بڑی اخلاقی امداد ہے کہ جگہ جگہ نصیحت اور عبرت کے سامان ہیں کہ ۱۹۴۹ء میں آزاد ہونے والی قوم کسی بیرونی امداد کے بغیر اب ہر چیز بنانے کی قدرت حاصل کر چکی ہے۔ کسی غیر ملک کی محتاج نہیں ہے۔ یہ مقام اُس نے کیسے حاصل کیا اسے دیکھنے کی اجازت دینا ایک بہت بڑی مدد ہے۔ امریکی امداد کے ساتھ آنے والے مہنگے مشیر جو مشورے لاکھوں روپے میں دیتے ہیں، وہ یہاں اپنی آنکھوں دیکھنے سے از خود مِل جاتے ہیں۔ طاقت



مسٹر محمود شام اور مسٹر اصحاب نقوی تن من اسکوائر کے سامنے کھڑے ہیں

کا سرچشمہ عوام ہیں۔ عوام کے دست و بازو۔ تمام وسائل سے زیادہ زرخیز ہیں۔ معدنی، زرعی، صنعتی وسائل ان ہی بازوؤں کے مرہون منت ہیں۔ ہر بازو کی قوت کا مکمل مصرف کیا جائے تو اس کا نتیجہ کیا نکلتا ہے۔ بے روزگاری بھی دور ہوتی ہے۔ ان باتوں پر تو چین کے رپورتاژ میں تفصیلاً لکھوں گا۔ فی الحال تو اس دورے کے سیاسی، اقتصادی اور عسکری نتائج کا مختصر ذکر کرنا ہے۔

چیئرمین ماؤزے تنگ

اور چو۔ این لائی سے بات چیت

پنڈی سے چلنے سے پہلے تو ہمیں یقین اسی وقت سے تھا کہ چیئرمین ماؤزے تنگ سے چیئرمین بھٹو کی ملاقات ضرور ہوگی۔ ممکن ہے باقی وفد کی بھی ملاقات ہو سکے۔ چیئرمین ماؤزے تنگ سے بہت کم غیر ملکی ملاقات کر سکتے ہیں۔ کئی مہینوں بعد پہلے ہیل سلاسی سے ملاقات ہوئی تھی۔ شاید اکتوبر میں۔ اس کے بعد یہ دوسری ملاقات تھی۔ جو چیئرمین بھٹو کی۔ ہم کو دو ر کی شام کو یہ ملاقات ہوئی۔ ملاقات آدھ گھنٹے سے کچھ زیادہ طویل رہی۔ اس میں پاکستان کی سیاسی صورت حال بھارتی توسیع پسندوں کے اقدامات، روسی ترمیم پسندوں کی پالیسیاں اور مسلم ممالک کا کردار زیر غور آیا۔ پاکستان سے چیئرمین بھٹو اس ملاقات کے لئے اکیلے گئے تھے۔ وزیراعظم چو۔ این۔ لائی ساتھ تھے۔ چیئرمین ماؤزے تنگ نہایت گرمجوشی سے ملے۔ اس ملاقات کے بارے میں تاثر یہ ہے کہ چیئرمین ماؤزے تنگ نے چین اور تیسری دنیا کے تعلقات میں پاکستان کے ماضی اور مستقبل میں اہم کردار پر زور دیا اور کہا کہ ۲۴ سال تک پاکستان غیر ملکی امداد لینے کے باوجود پاکستان آج بھی دوسروں کا محتاج ہے اور وہاں کے عوام آج بھی پریشان حال ہیں۔ جب تک پاکستان کے عوام خوش حال اور مضبوط نہ ہوں گے۔ اس وقت تک پاکستان اپنا بین الاقوامی سیاسی کردار مضبوطی سے انجام نہیں دے سکتا۔ آپ کی طاقت صرف اور صرف عوام میں ہے اور ان طاقتوں میں جو سامراج دشمن کردار ادا کر رہی ہیں۔ اپنے عوام کی طاقت پر بھروسہ کرتے ہوئے آپ عوام کی خوش حالی کے لئے جو کام کریں گے۔ ہم اس میں آپ کا ساتھ دیں گے۔ اگر عارضی طور پر پاکستان کے عوام کو شکست ہوئی بھی ہے تو بالآخر فتح اُن کی ہوگی۔

چو این لائی نے کیا کہا

چو این لائی پاکستان سے بہت محبت کرتے ہیں۔ اور ذوالفقار علی بھٹو سے بھی کہ ان کا کردار سامراج دشمن رہا ہے۔ پیکنگ ایئرپورٹ پر آمد سے لے کر ایئرپورٹ سے روانگی تک وزیراعظم چو۔ این۔ لائی ہمارے ساتھ رہے۔ ان کے ساتھ ان کے وزراء اور فوج کے بہت سے اعلیٰ ترین افسر بھی تھے۔ مگر سب ایک سے لگتے تھے۔ چین میں ۴۸ گھنٹے کے قیام کے دوران وزیراعظم چو این لائی سے صدر بھٹو کی بات چیت ۱۴ گھنٹے سے زیادہ ہوئی۔ اس میں تقریباً ½ ۱ گھنٹہ بات چیت دوسرے لوگوں کی موجودگی میں ہوئی۔ اس کے علاوہ ڈنر اور لنچ پر تقریر، جوابی، تقریر کے ذریعے بھی گفتگو ہوتی رہی۔ ۴ گھنٹے کی گفتگو میں آپس کی بات بھی ہے۔ سرکاری وفود کی موجودگی میں بات چیت بھی ہوئی۔

وزیراعظم چو۔ این۔ لائی اور صدر بھٹو کے درمیان جن نکات پر بات ہوئی ان میں سے اہم ترین یہ تھے۔

۱۔ پاکستان میں عوام کے ساتھ اب تک جو زیادتیاں ہوئی ہیں، ان کا ازالہ کیسے ہو۔

۲۔ مسلم ممالک نے پاکستانی موقف کا جو ساتھ دیا ہے اور ایک رائے اختیار کی ہے۔ مسلم ممالک کی اس وحدت کو برقرار رکھا جائے۔

۳۔ امداد پر بھروسہ کرنے سے ملک محتاج ہو کر رہ جاتا ہے اس لئے امداد سے گریز اور اپنے آپ پر بھروسہ کیا جائے۔

۴۔ فوجی امداد کا جہاں تک تعلق ہے۔ حالات کے مطابق یہ طے کیا جائے کہ آپ کتنی ملٹری رکھنا چاہتے ہیں۔

دوسروں کی امداد کی محتاجی

چین اور پاکستان ایک لازوال دوستی میں منسلک ہیں۔ اب کے اچھے اور گہرے دوستوں کی طرح انہوں نے کھل کر باتیں کی ہیں۔ کوئی چیز چھپائی نہیں۔ چینیوں نے یاد دلایا کہ انہوں نے کیا کیا مشورے دیے تھے اور پاکستانیوں نے کیا کیا وعدے کئے تھے۔ پاکستانیوں نے بتایا کہ ان کے عوام کیا چاہتے تھے اور وہ کتنے مجبور ہیں۔ اُن کے ساتھ کیا کچھ نہیں ہوا۔ اس لئے چو۔ این۔ لائی نے کھل کر کہا کہ ہم جو فوجی امداد دیتے ہیں۔ وہ مسلح جارحیت کے مقابلے کے لئے دیتے ہیں۔ اپنے عوام کو کچلنے کے لئے نہیں۔ اسی طرح انہوں نے اس ہمدردی کا اظہار بھی کیا کہ امداد ملکوں کو محتاج بنا دیتی ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہماری امداد بہت معمولی ہوگی۔ پاکستانی پریس سے خاص طور پر درخواست ہے کہ وہ اس کو بڑھا چڑھا کر پیش نہ کریں۔ ان کا مطلب یہی تھا کہ پاکستانی عوام کو یہ احساس نہ ہونے دیا جائے کہ چین کی امداد آ گئی ہے۔ اس لئے ہم محفوظ بھی رہیں گے اور ترقی بھی کر لیں گے۔ انہوں نے کہا کہ ترقی کرنی ہے تو پاکستان اپنی قوت پر اعتماد کرنے سے ہی کر سکتا ہے۔ دوسروں کی امداد کا محتاج ہونے سے نہیں۔

جنگ نہ چھیڑیے

انہوں نے یہ بھی صاف صاف کہہ دیا کہ آپ جنگ کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ آپ کے عوام پریشان ہیں۔ بدحال ہیں ایسے میں جنگ انہیں اور خراب حال کرتی ہے۔ اس لئے آپ جہاں تک ممکن ہو جنگ سے گریز کریں۔ اور اپنے آپ کو مضبوط کر لیں اور پھر جنگ لڑیں تو ایسی کہ جب تک آپکا مقصد حل نہ ہو۔ جنگ ختم نہ کریں۔ آپ کی مدد کریں گے۔

پیشہ وارانہ جنگ آپ کا کام نہیں

یہ برطانوی طرز کی پیشہ وارانہ جنگ لڑنا آپ جیسے چھوٹے اور کمزور ملکوں کا کام نہیں ہے کہ آپ نے چھ جہاز گرائے۔ دشمن نے آپ کے دو جہاز گرائے۔ چار گولیاں آپ نے چلائیں چھ دشمن کی طرف سے چلیں۔ اسلحہ ضائع ہوتا رہا۔ بات کچھ نہ بنی۔ پھر جنگ بندی ہو گئی۔ اور مسئلہ یو۔ این۔ میں چلا گیا۔ یہ

باقی صفحہ ۳۲ پر ملاحظہ فرمائیں



پیکنگ میں کمبوڈیا کی جلا وطن حکومت کے سربراہِ مملکت

پرنس سہانوک سے محمود شام کی خصوصی ملاقات



نکسن کی

چین میں آمد

کے دوران

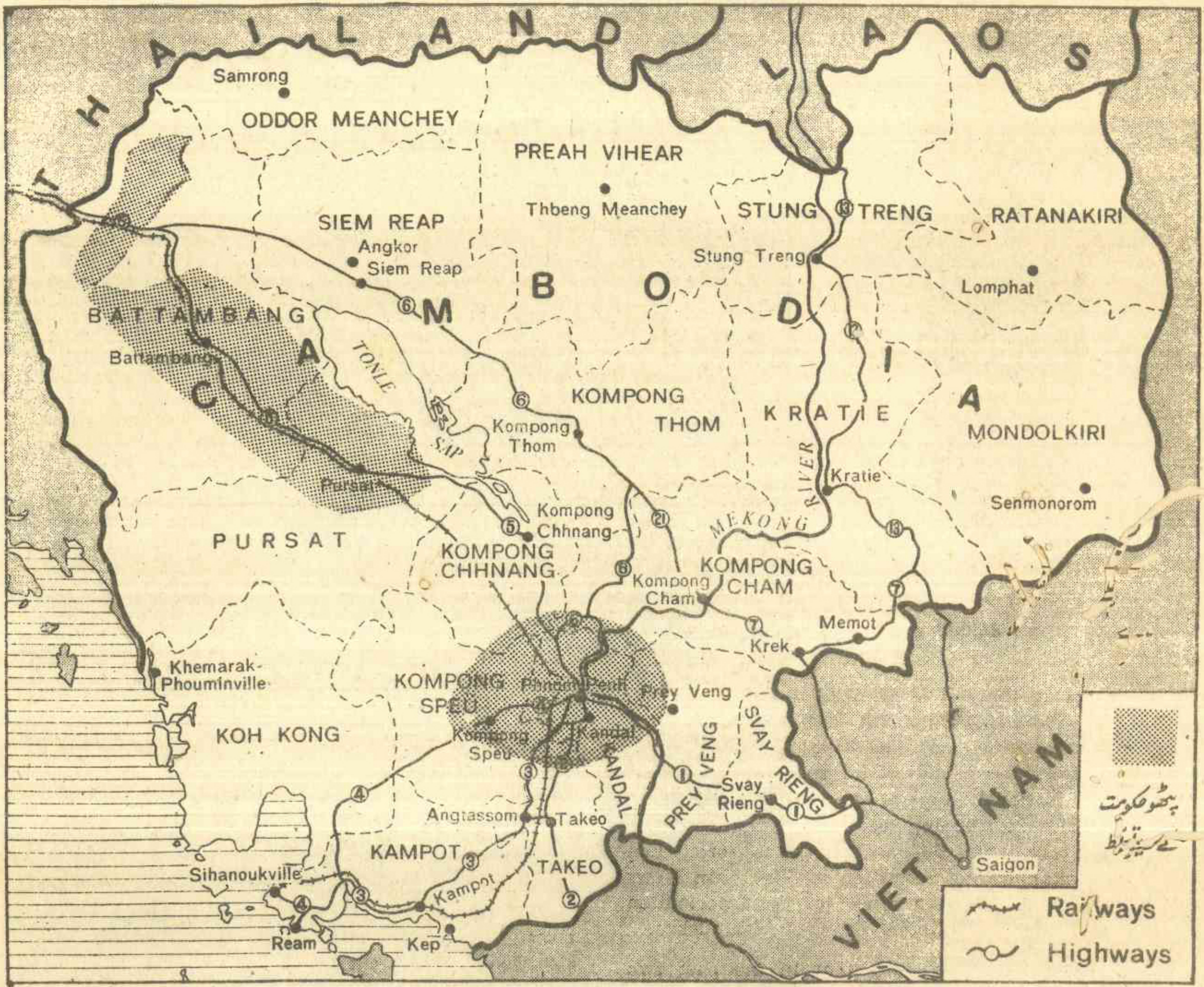
ہند چینی

میں شدید لڑائیاں

ہوں گی

پرنس سہانوک نے کہا: 'اگلے برس میں نوم پنہ میں ہوں گا'

عظیم ہال میں وزیراعظم چو این لائی نے صدر بھٹو کے اعزاز میں عشائیہ دیا۔ صدر بھٹو چین میں مقیم غیر ملکی سفیروں سے مل رہے تھے۔ ہم ایک طرف کھڑے تھے۔ دروازے میں سے مجھے ایک شکل شناسا سی لگی میں نے روزنامہ "سن" کے اصحاب نقوی سے کہا کہ "ارے یہ تو پرنس سہانوک ہیں۔ چلو ملتے ہیں"۔ ہم دونوں بھاگم بھاگ ان کے پاس پہنچے۔ تعارف کروایا۔ انہیں پتہ چلا کہ ہم پاکستانی صحافی ہیں تو نہایت گرمجوشی سے ہاتھ ملایا۔ پھر مادام سہانوک سے ملوایا۔ میں نے کہا کہ ہم آپ سے کچھ الگ بات چیت کرنا چاہتے ہیں۔ کمبوڈیا کے سربراہِ مملکت نے اگلے روز صبح دس بجے کا وقت دے دیا۔ پرنس سہانوک آجکل پیکنگ میں کمبوڈیا کی جلاوطن حکومت کے سربراہ کی حیثیت سے مقیم ہیں اور یہیں سے ہی اپنی سپاہِ آزادی کی کمان کر رہے ہیں چین کی حکومت انہیں ہر قسم کی امداد فراہم کر رہی ہے وہ ایک بہت بڑے محل میں مقیم ہیں۔ یہیں ان کے وزراء



سپاہِ آزادی کے قبضے میں ۳/۴ ، پِٹھّو فوجوں کے قبضے میں ۱/۴

بھی موجود ہیں اور سپاہِ آزادی کے مختلف عہدیدار بھی۔ وہ روزانہ یہاں امورِ مملکت نبھاتے ہیں اور اپنا لائحۂ عمل طے کرتے ہیں۔

ہم نے اس عشائیے میں پرنس سہانوک کی پرجوش تقریر بھی سُنی۔ انہوں نے بڑی صاف انگریزی میں اظہارِ خیال کیا اور کہا کہ جس طرح کمبوڈیا کو امریکی سامراج نے ٹکڑے ٹکڑے کرنے کی کوشش کی ہے۔ پاکستان کے ساتھ بھی یہی کچھ ہُوا ہے۔ انہوں نے یقین ظاہر کیا کہ مشرقی اور مغربی پاکستان ایک ہو کر رہیں گے۔

اگلی صبح ہمیں بتایا گیا کہ کمبوڈیا کی مملکت کے سربراہ ہمارا انتظار کر رہے ہیں۔ چین کی بنی ہوئی گاڑی "سنگھائی" ہمارا انتظار کر رہی ہے۔ مَیں اور نقوی گاڑی میں سوار۔ برف کی چادر میں لپٹے پیکنگ کی شاہراہوں سے ہوتے ایک محل کے دروازے سے اندر داخل ہوئے۔ ایک کمبوڈین خاتون ہمیں سیڑھیوں پر بچھے سُرخ قالین سے اوپر لے گئیں۔ ہر طرف سُرخ قالین بچھے تھے۔ دور سے پرنس سہانوک آتے دکھائی دیئے۔ ملاقات شروع ہوئی۔ نقوی کے سوال کے جواب میں پرنس نے بتایا کہ وہ ہندچینی میں سب سے بڑی عوامی تحریک کے قائد ہوچی منہ کو نہ صرف اپنا بڑا بھائی خیال کرتے ہیں بلکہ انقلاب کا سرچشمہ سمجھتے ہیں۔ اگرچہ ہمارا آبائی پس منظر مختلف ہے لیکن ہمارے نظریات مشترک ہیں۔ مَیں ایک شاہی خاندان میں پیدا ہُوا اور میرا اس سے تعلق ہے جبکہ ہوچی منہ ایک محنت کش گھرانے کے فرد تھے۔ ہمارے نظریات اور جدوجہد مشترک تھی۔ ہم نے ہندچینی کو فرانسیسی استعمار کے پنجے سے نجات دلائی۔ ہم جانتے ہیں کہ فرانسیسی استعمار کی امریکی سامراج کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں ہے مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ امریکی مجھ سے اتنی نفرت کیوں کرتے ہیں؟ صرف اس لیے کہ مَیں نے حریت پسند ویت کانگ کی حمایت کی جب انہوں نے انقلابی حکومت قائم کی تو مَیں نے اس حکومت کو فوراً تسلیم کیا اور اس سے باقاعدہ سفارتی تعلقات قائم کر لیے۔ میں نے اپنی حمایت کو صرف الفاظ تک محدود نہ رکھا بلکہ عملی مدد کی۔ اپنے سرحدی علاقوں میں ویت کانگ کو اپنے خفیہ اڈے بنانے کی اجازت دی"۔

انہوں نے نہایت جذباتی لہجے میں کہا "یہ تو ان حریت پسندوں کی مدد تھی۔ کمبوڈیا کی سلامتی کے خلاف کوئی سازش یا خطرہ نہیں تھا جیسا کہ نوم پنہ میں لوم نول کی حکومت الزام لگاتی ہے اور مجھ جیسے شخص کو کمبوڈیا کے عوام سے غداری کا مرتکب قرار دیتی ہے"۔ یہاں پرنس سہانوک کی آواز بھرا گئی۔ پھر انہوں نے جذبات پر قابو پاتے ہوئے کہا "کمبوڈیا کے عوام سامراج کے بدترین دشمن ہیں بالکل اسی طرح جیسے لاؤس، شمالی ویت نام اور ہندچینی کے دوسرے علاقوں کے لوگ ہیں۔ مَیں نے اپنے وطن کو ہر ممکن انداز سے آزاد و خود مختار رکھنے کی کوشش کی۔ کمبوڈیا کے عوام کی طرف سے مجھ پر یہ فرض عاید تھا اسی طرح میرا یہ فرض بھی تھا کہ اپنے برادر ملکوں کو آزاد رہنے میں

’سائیگان کی پٹھو حکومت جدید ترین

امریکی اسلحہ سستے داموں ہمارے ہاتھ فروخت کر دیتی ہے‘

مدد کروں۔ اپنے ہمسایہ ملکوں کے مفاد کے لیے مَیں نے اس سے اتحاد برقرار رکھا۔ مجھے معلوم تھا کہ اگر آج ہم نے سامراج کے خلاف اپنے بھائیوں کی مدد نہ کی تو کل ہم بھی اس سامراج کی جارحیت کا شکار ہو سکتے ہیں۔ تیسری دنیا میں آزادی اور حق کی فتح تک لڑنے کا جو جذبہ ہے اسے برقرار رکھنا چاہیئے آزاد رہنا ہر قوم کا حق ہے۔ ہماری دعا ہے کہ فلسطینیوں کو بھی اپنی جدوجہد میں کامیابی ہو اور اسرائیل ان کے مقبوضہ علاقے خالی کرے“

پھر پرنس سہانوک نے اپنی سادہ مگر زوردار انگریزی میں بتایا کہ ”مَیں ہند چینی میں آزادی کی تحریکوں کے سبب سے میں چین سے مکمل اتفاق رائے رکھتا تھا لیکن میرے پاس ہتھیار نہیں تھے جو مَیں ویت کانگ کو دے سکتا۔ چین نے ویت کانگ کو ان کے جنگلوں میں سہانوک بندرگاہ کے ذریعے اسلحہ پہنچایا۔ سی آئی اے کو جب یہ معلوم ہوا تو انہوں نے فیصلہ کیا کہ سہانوک کو اپنی راہ سے ہٹایا جائے اور اسی لیے آج آپ مجھے نوم پنہ کی بجائے پیکنگ میں دیکھ رہے ہیں“

میرے ایک سوال کے جواب میں پرنس سہانوک نے بتایا کہ ”مَیں یہاں پیکنگ میں بیٹھ کر اپنی قومی تحریکِ آزادی کی قیادت کر رہا ہوں۔ میری حکومت کے کل بیس وزیر ہیں۔ ان میں سے دس وزراء کمبوڈیا کے اندر اس تحریک کی کمان سنبھالے ہوئے ہیں اور مختلف علاقوں کا نظم و نسق بھی سنبھالے ہوئے ہیں۔ دس وزراء یہاں میرے ساتھ پیکنگ میں مقیم اس عوامی جدوجہد کی قیادت کر رہے ہیں۔ ہماری تحریک مکمل طور پر منظم ہے چین ہمیں ہر طرح کی امداد دے رہا ہے“

پھر سہانوک نے ہمارے سوال کرنے سے پہلے ہی پاکستان کے مسائل پر بات شروع کر دی۔ ان کی آنکھوں میں آنسو تھے اور آواز میں کرب! کہنے لگے ”کمبوڈیا اور پاکستان کے مسائل ایک سے ہیں۔ مَیں پاکستان کے مؤقف کی مکمل تائید کرتا ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ پاکستان کے عوام اپنے نصب العین کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں۔ یہ ایک مسلّمہ عالمی اصول ہے کہ ”حکومتوں کو ٹکڑے ٹکڑے نہیں کیا جا سکتا“ بعض بڑی طاقتوں کی سازش ہے کہ کمبوڈیا کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے جس طرح ویت نام اور کوریا کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ ہم اس بات کے حق میں ہیں اور اس کے لیے جدوجہد بھی کر رہے ہیں کہ ویت نام اور کوریا کو ایک ہونا چاہیئے۔ اسی طرح پاکستان کا مسئلہ بھی واضح ہے۔ اگر پاکستان کے کچھ علاقوں کے عوام کے آپس میں اختلافات بھی تھے، تو یہ پاکستان کے عوام کا کام ہے کہ وہ ان اختلافات کو آپس میں بیٹھ کر دور کریں۔ یہ نہیں کہ دوسری طاقتیں اس میں مداخلت کر کے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیں۔ مَیں آپ کے صدر ”ذوالفقار۔ علی۔ بھٹو“ کے مؤقف کو برحق سمجھتا ہوں۔ کہ یہ مسائل مشرقی اور مغربی پاکستان کے سیاسی رہنماؤں کو آپس میں طے کرنے چاہئیں اور دنیا کو چاہیئے کہ انہیں آپس میں بات چیت کرنے کا موقع دے۔ میں نے جیسا کہ رات تقریر میں کہا تھا کہ بالآخر فتح پاکستان کے عوام کی ہو گی۔ جارح فوجوں کو یہ علاقے خالی کرنے پڑیں گے، مشرقی اور مغربی پاکستان ایک ہو کر رہیں گے!“

پھر کمبوڈیا میں قومی تحریکِ آزادی کی کامیابیوں کے سلسلے میں بات چلی تو انہوں نے ایک نقشے کے ذریعے ہمیں بتایا کہ ”کمبوڈیا کے تین چوتھائی حصّے پر امریکہ کی پٹھو لون نول حکومت کا اب کوئی کنٹرول نہیں ہے۔ درمیان میں صرف ایک پٹی ان کے تسلط میں ہے جس میں نوم پنہ شامل ہے اور شمال مغرب میں ایک بندرگاہ بھی ہے اس پٹی میں بھی کئی سڑکوں اور ریلوے لائنوں پر کمبوڈیا کی سپاہِ آزادی کا قبضہ ہے۔ اس لیے اب لون نول ٹولہ ریلوے کے ذریعے کو استعمال نہیں کر سکتا۔ اس وقت کمبوڈیا میں لون نول ٹولہ اور امریکی سامراج تین سیٹلائٹ دارالحکومتوں، بنکاک، نوم پنہ اور سائیگاؤن میں واقع ہوائی اڈوں اور جدید مواصلاتی ذرائع سے اپنے تسلط کو برقرار رکھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اکثر امریکی ہوائی جہاز سائیگاؤں اور بنکاک کے اڈوں سے اڑ کر کمبوڈیا میں بمباری کرتے ہیں۔ لیکن اب وہاں سامراج کے آخری دِن ہیں۔ تین چوتھائی حصے پر سپاہِ آزادی کا مکمل قبضہ ہے۔ دس وزراء وہاں باقاعدہ موجود ہیں۔ جو پٹی امریکی سامراج کے پٹھوؤں کے قبضے میں ہے۔ اس کے پاس انتہائی شدید لڑائی ہو رہی ہے اور کئی جگہ سامراج کی گرفت ڈھیلی پڑ رہی ہے۔“



مادام سہانوک

انہوں نے نقوی کے ایک سوال کے جواب میں بتایا کہ گزشتہ ماہ سائیگاؤں کی طرف سے جنوبی ویت نام کے پچاس ہزار پٹھو فوجیوں نے بڑا شدید حملہ کیا تھا یہ حملہ بہت زوردار تھا مگر سپاہِ آزادی نے اس کا جان توڑ مقابلہ کیا اور انہیں بری طرح پسپا کر دیا۔ اس وقت لون نول ٹولے کے ساتھ دو لاکھ کمبوڈیا کے کرایہ کے سپاہی ہیں، ۲۵ ہزار جنوبی ویت نامی فوجی ہیں اور ایک بہت بڑی تعداد خود امریکی فوجی افسروں اور ماہرین کی ہے۔ کمبوڈیا کے کرائے کے سپاہی لڑنے میں اتنے تجربہ کار نہیں ہیں۔ جنوبی ویت نام کے فوجی خاصے بہادر تجربہ کار اور جدید ترین اسلحہ سے لیس ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ امریکی فضائیہ تین سیٹلائٹ دارالحکومتوں، بنکاک نوم پنہ اور سائیگاؤں سے بمباری کے لیے آتی ہے اور یہ ہوائی حملے تقریباً روزانہ ہوتے ہیں۔ لیکن ہمیں فخر ہے کہ کمبوڈیا کے عوام اس لڑائی میں تنہا نہیں ہیں۔ بلکہ ہند چینی کے دوسرے تمام علاقوں ویت نام، لاؤس میں بھی یہ جنگ جاری ہے اور اس وقت تک جاری رہے گی۔ جب تک ہمارا مقصد حاصل نہیں ہوتا۔“

میرے ایک سوال کے جواب میں انہوں نے بتایا کہ وہ اس جنگ کے بعد کمبوڈیا کے اندر تو نہیں گئے، لیکن شمالی ویت نام کی سرحد کے قریب جا کر انہوں نے اپنی سپاہ آزادی کے کمانڈروں سے ملاقات کی۔ اس طرح وہ اب تک دو مرتبہ جا چکے ہیں۔ انہوں نے



سپاہِ آزادی کا ایک کمانڈر بچوں کو تربیت دے رہا ہے

بڑی حیرت سے کہا کہ "نجانے یہ شمالی ویت نام والے مجھے کمبوڈیا میں جانے کی اجازت کیوں نہیں دیتے۔ حالانکہ میں اگر اپنے لوگوں کے درمیان پہنچ جاؤں تو اس سے تحریک آزادی یقیناً اور تیز ہو سکتی ہے۔" انہوں نے بتایا کہ "میں اب پھر عنقریب شمالی ویت نام جا رہا ہوں۔"

پرنس سیہانوک نے انکشاف کیا کہ وہ نکسن کے دورۂ چین کے دوران چین میں نہیں رہیں گے۔ اور جب نکسن صاحب چین میں ہوں گے۔ اس وقت ہند چینی میں اور زیادہ شدید جنگیں ہوں گی۔ نکسن کبھی نہیں جیت سکتا۔ ہم نے کہا۔ آپ نکسن سے نہیں ملیں گے۔ انہوں نے بڑے زور سے نفی میں جواب دیا اور کہا کہ "جب تک وہ خود ملنے کی پیش کش نہ کرے۔ میں اس سے نہیں مل سکتا۔ اب تو وہ چین کے رہنماؤں سے بات کرنے آ رہے ہیں۔ اب یہ چین سے ملنے کا وقت ہے۔ جہاں تک کمبوڈیا میں جنگ کا تعلق ہے۔ اس وقت تک اس کا مسئلہ طے نہیں ہو سکتا۔ جب تک نکسن مجھ سے نہیں ملتا۔ یہ ایک حملہ آور اور اس فریق کے درمیان ملاقات ہو گی۔ جس پر حملہ کیا گیا ہے۔ ایک جارح اور مجروح کی یہ ملاقات ہی ہند چینی میں امن کے قیام کا ذریعہ ہو سکتی ہے۔"

میرے پوچھنے پر کمبوڈیا کی حکومت کے سربراہ نے بتایا کہ "اب تک ہماری قومی حکومت کو چین سمیت ۲۸ ملکوں نے تسلیم کیا ہے اس میں شمالی ویت نام، رومانیہ، شمالی کوریا۔ البانیہ۔ یوگوسلاویہ اور افریقہ کے ۱۹ ممالک بھی شامل ہیں۔ روس اور اس کے طفیلی ممالک نے ابھی تک اسے تسلیم نہیں کیا۔ مجھے بڑی امید تھی کہ روس حق کو تسلیم کرے گا۔ روس اور چین بڑی انسان نواز طاقتیں ہیں ہمیں یقین تھا کہ روس اس جنگ میں ہماری مدد کرے گا۔ مگر اس نے لون نول ٹولے کی حکومت کو تسلیم کر لیا ہے۔ اور اب روس کا کیا ہے وہ اور اس کے طفیلی ممالک بنگلہ دیش کو تسلیم کر رہے ہیں۔ حالانکہ بنگلہ دیش پاکستان کا ایک حصہ ہے۔ ہمارے نزدیک تو مشرقی اور مغربی پاکستان ایک ہیں۔ روسی ایک عجیب قسم کی چال چل رہے ہیں۔ وہ کبھی سامراج دشمن تھے۔ ہمیں تو ان سے پہلے روز سے ہی امداد کی توقع تھی۔ مگر انہوں نے ہماری درخواست کو مسترد کر دیا۔ میں نے پیش کش کی تھی کہ میں اپنے ہیڈ کوارٹر ماسکو اور پیکنگ دونوں جگہ بناؤں۔ چھ ماہ پیکنگ میں قیام کروں اور چھ ماہ ماسکو میں۔ مگر وہ تو اس منصوبے پر عمل کر رہے ہیں کہ اگر تم حکومت کرنا چاہتے ہو تو انہیں ٹکڑوں میں بانٹ دو۔ مثالیں آپ کے سامنے ہیں۔ شمالی کوریا، جنوبی کوریا۔ شمالی ویت نام، جنوبی ویت نام۔ اسی طرح آپ کے ملک کے دو حصے کر دیے گئے ہیں۔"

سی آئی اے کی
مخالفت کی وجہ سے
آج میں نوم پنہ
کی بجائے
پیکنگ میں ہوں

فوجی مدد کے سلسلے میں انہوں نے بتایا کہ "ہمیں سب سے زیادہ مدد چین سے ملی ہے۔ اس کے علاوہ شمالی کوریا سے اور تھوڑی بہت کیوبا سے۔ لیکن ہمیں مدد دینے والی طاقتوں میں دوسری بڑی طاقت امریکہ ہے۔" "ہم نے امریکہ سے بہت زیادہ فوجی امداد لی ہے۔" لون نول کے سپاہی بڑے ناکارہ ہیں۔ ان سے اسلحہ چھیننا بہت آسان ہے۔ پھر ہم سائیگان کے ٹولے سے بھی جدید ترین اسلحہ سستے داموں خرید لیتے ہیں۔ سائیگان والے اسلحہ کے بڑے اچھے تاجر ہیں۔ وہ امریکہ کے جدید ترین ہتھیار ہمیں مناسب داموں پر فروخت کر دیتے ہیں۔ انہوں نے تو ہمیں ہیلی کوپٹر بیچنے کی بھی پیش کش کی ہے۔ شمالی ویت نے ہمیں جو اسلحی امداد دی ہے۔ اس میں روسی اسلحہ بھی ہے۔ ۱۲۲ ایم ایم راکٹ جو ۱۳ کلو میٹر سے اپنے نشانے پر ضرب لگاتا ہے۔ ہم نے نوم پنہ کے ہوائی اڈے پر ان ہی روسی راکٹوں سے حملہ کیا تھا۔"

میرے ایک سوال کے جواب میں انہوں نے بتایا کہ "گزشتہ مرتبہ جب صدر بھٹو پاکستان پیپلز پارٹی کے چیئرمین کی حیثیت سے چین آئے تھے تو میری ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ وہ میرے ویسے بھی بہت اچھے دوست ہیں۔ انہوں نے مجھے کہا تھا کہ ہم آپ کی حکومت کو تسلیم کریں گے۔ باقاعدہ سفارتی تعلقات نہ سہی، لیکن ہمارے مخلصانہ تعلقات ہیں۔ اقوام متحدہ میں پاکستانی وفد نے کھل کر کہا تھا کہ لون نول ٹولے کی حکومت کمبوڈیا کی نمائندہ حکومت نہیں ہے۔ نکسن صاحب کو ابھی چین کا دورہ کرنا ہے۔ اس کے بعد حالات میں خاصی تبدیلیاں آئیں گی۔ پاکستان اپنے مسائل کے سلسلے میں اتنا الجھا ہوا ہے کہ ان امور کی طرف ابھی توجہ نہیں دے سکتا۔ صدر بھٹو حقیقی طور پر ہماری مدد کرنا چاہتے ہیں۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ انہوں نے اپنی انتخابی مہم کے دوران میری حکومت کو جائز حکومت قرار دیا۔"

میں نے پاکستان کے عوام کے نام پیغام لینے کے لئے پوچھا تو انہوں نے کہا کہ "پاکستان کے عوام اور حکومت کے لئے میں اپنی حکومت اور عوام کی طرف سے برادرانہ جذبات کا اظہار کرنا چاہتا ہوں۔ پاکستان کے عوام خواہ وہ مغربی پاکستان میں ہوں یا مشرقی پاکستان میں وہ اپنی سلامتی اور خود مختاری کے لئے جدوجہد کر رہے

باقی صفحہ ۳۴ پر ملاحظہ فرمائیں

اگر ملک ہاتھوں سے جاتا ہے، جائے

تو بھٹو کی ہرگز نہ کرنا حمایت

ابراہیم جلیس

افغانستان کے ایک بادشاہ امان اللہ خان اور ان کی بیگم ملکہ ثریا اعلیٰ تعلیم یافتہ اور ترقی پسند فرمانروا تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ افغانستان کے مرد اور عورت جہالت کے گڑھے سے نکل کر علم اور ترقی کی شاہراہ پر گامزن ہوں۔

افغانستان کے جاگیردار، زمیندار اور سرمایہ دار طبقے یہ کیسے گوارا کر سکتے تھے کہ غریب افغان عوام جہالت کے کھڈے سے نکل کر اُن کے مدِ مقابل کھڑے ہو جائیں چنانچہ امیر اور سرمایہ دار افغانوں نے زرخرید مولوی اور ملاؤں کے ذریعے شاہ امان اللہ خان کے خلاف بڑا سوچا سمجھا پراپیگنڈہ شروع کر دیا۔

اُس وقت تک افغان عوام، عورت کے پردے کے شدّت سے قائل تھے۔ افغان سرمایہ داروں، جاگیرداروں اور اُن کے زرخرید مولوی ملاؤں کا یہ پراپیگنڈہ عوام کے "مذہبی جذبات" کو بھڑکانے لگا کہ

"ملکہ ثریا مسلمان عورت ہو کر بے پردہ
پھرتی ہے اور فرنگی میموں کی طرح عریاں
پنڈلیوں والا اسکرٹ پہنتی ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔"

یہ پروپیگنڈہ سادہ و معصوم افغان عوام کے صاف ستھرے مذہبی جذبات کی آگ پر تیل کی طرح گرا اور بھڑک اٹھا ——

شاہ امان اللہ خان کو جلاوطن ہونا پڑا اور افغانستان کے جاگیرداروں اور سرمایہ داروں نے اطمینان کی سانس لی اور زرخرید ملاؤں کو مالا مال کر دیا۔

علمائے حق یعنی سچے عالمانِ دین اور حقیقی پیشوایان مذہب کبھی بھی جاگیرداروں، سرمایہ داروں اور نوکر شاہوں کے آلۂ کار نہیں بن سکتے۔ البتہ "علمائے سوء" یعنی کٹھ ملا ہی سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کے حکم اور پیسے کے عوض۔

ع۔ خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں
یا ع۔ تا دیل سے قرآں کو بنا دیتے ہیں پازند۔

- پاکستان میں بھی ہو بہو ایک ایسا ہی فتنہ سر اٹھا رہا ہے۔
- افغانستان میں ملکہ ثریا کی بے پردگی کو بہانہ بنایا گیا تھا۔
- پاکستان میں شراب کی بوتل کو نشانہ بنایا جا رہا ہے۔

یہ منافقت واقعی محلِ نظر ہے کہ ملک کے پہلے عام انتخابات دو سمبر ۱۹۷۰ء میں ذلّت آمیز شکست خوردہ دائیں بازو کے نام نہاد لیڈر اور مالکان اخبارات صدر بھٹو کے سامنے تو اُن کی حمایت کرنے کا پورا پورا یقین دلاتے ہیں اور اُن کی پیٹھ پیچھے اُن کے خلاف نہایت گھناؤنی سازشوں میں مصروف ہیں۔

ایسے ہی منافقوں میں سے ایک منافق سے ہماری ملاقات ہوئی تو دورانِ گفتگو میں انہوں نے کہا۔

"بھارت نے پاکستان کے وجود کو ابھی تک دل سے تسلیم نہیں کیا ہے۔"

ہم نے جواباً ان کی دُکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا۔

"اور قبلہ —— آپ نے بھی ابھی تک بھٹو اور اُن کی عوامی حکومت کو دل سے تسلیم نہیں کیا ہے۔"

ہمارے جواب پر وہ بوکھلا کر بولے۔

"لاحول ولا قوۃ —— میں بھارت کی بات کر رہا ہوں۔ آپ بھٹو کا ذکر لے بیٹھے۔"

ہم نے اُن کی گیند واپس اُن کے کورٹ میں پھینک دی۔

"بزرگو —— آپ ہی کی تیکنیک استعمال کر رہا ہوں۔ آپ کے دل میں بھٹو کی عوامی حکومت کے خلاف بغض بھرا ہوا ہے اور آپ عوام کے جذبات بھڑکانے کے لئے شراب کی بوتل لے آئے ہیں۔"

مولانا صاحب جواب کیا دیتے۔ بغلیں جھانکتے، استغفر اللہ لاحول ولا بڑبڑاتے وہاں سے چلے گئے۔

اس وقت ملک کے سامنے سب سے اہم مسائل یہ ہیں۔

- مشرقی پاکستان کا مغربی پاکستان سے الگ ہو جانا۔
- سوا لاکھ کے لگ بھگ بھارت کے زندانوں میں ہمارے فوجی اور غیر فوجی بھائیوں کی باعزت رہائی۔
- جنگ کے شہداء کے ورثاء کے غم کا مداوا۔
- بنگلہ دیش میں غیر بنگالی پاکستانی باشندوں کا مستقبل۔
- بچے کھچے پاکستان سے مارشل لاء کی لعنت کا خاتمہ اور جمہوریت کی فوری بحالی۔
- عادلانہ معاشی نظام کے تحت ترقی پسند معاشرے کی از سرِ نو تشکیل۔

لیکن —— اِن سارے اہم ترین اور فوری طور پر حل طلب قومی مسائل کو چھوڑ کر ہمارے "اسلام پسند لیڈر" کیا لے کر آئے ہیں۔؟

"شراب کی بوتل"۔

جیسے اب اگر پاکستان میں شراب پر پابندی عاید کر دی گئی تو پھر ہمارا چھینا ہوا مشرقی پاکستان یعنی بنگلہ دیش، ہمیں واپس مل جائے گا —— پاکستان میں شراب بند ہو گی تو ہمارے سوا لاکھ کے لگ بھگ قیدی بھائی بھارت کی قید سے آزاد ہو جائیں گے۔

شراب پر بندش سے بنگلہ دیش میں غیر بنگالی پاکستانی باشندوں کو از سرِ نو نعمتِ حیات مل جائے گی۔

شراب پر امتناع سے جمہوریت بحال ہو جائے گی۔ اسلامی نظام رائج ہو جائے گا اور پاکستان اسم بامسمیٰ ہو جائے گا۔!

بریں عقل و دانش بباید گریست۔

افغانستان میں —— ملکہ ثریا۔
پاکستان میں —— شراب کی بوتل
کٹھ ملا کہیں کا ہو —— اپنے سرمایہ دار آقاؤں کے تحفظ کے لئے وہ اپنی بندوق ہمیشہ فوراً سادہ و معصوم

افغانستان میں ملکہ ثریا کی بے پردگی اور پاکستان میں شراب کی بوتل

مسلم عوام کے کندھوں پر رکھ دیتا ہے۔

ہمیں تو حیرت جناب اے کے بروہی، ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی اور جی اے مدنی صاحبان پر ہو رہی ہے۔ یہ صاحبان بڑے عالم فاضل دانشمند اور جہاندیدہ سمجھے جاتے ہیں۔ انہیں بھلا کیا ہوا کہ یہ بھی بعض مفاد پرست سیاسی کارکنوں کے بہکاوے میں آکر شراب کے خلاف تحریک چلانے کے جھنڈے لے کر نکل کھڑے ہوئے۔

پچھلے دنوں کراچی میں جماعت اسلامی کی ایک ذیلی تنظیم جمعیت الفلاح کے ایک مذاکرے میں ان صاحبان ذی وقار نے قیام پاکستان کے ۲۴ برس بعد اور نصف پاکستان کھو دینے کے بعد بھی پہلی منتخبہ عوامی حکومت کے خلاف ایک ڈھکی چھپی سازش کا آغاز کیا ہے۔

عام انتخابات میں شکست خوردہ امیدوار جناب اے کے بروہی نے اسلام پسندوں سے اپیل کی ہے کہ:

"شراب کی لعنت ختم کرنے کے لیے ہمیں ملک گیر مہم چلانی چاہیئے۔ گھر گھر جاکر عوام کو اس کی برائیوں سے آگاہ کرنا چاہیئے۔ ہمیں شراب خانوں میں شرابیوں کے پاس جانا چاہیئے اور انہیں شراب پینے سے منع کرنا چاہیئے۔"

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی نے قیام پاکستان کے پورے ۲۴ برس بعد یہ انکشاف فرمایا کہ "شراب اُم الخبایث ہے۔ اگرچہ ہمارے ملک میں شراب پینے والوں کی تعداد صرف ایک فی صد ہے۔ لیکن یہ ایک فی صد طبقہ ہماری تعلیم، صنعت، زراعت بلکہ حکومت پر قابض ہے۔"

جماعت اسلامی کا ترجمان اخبار "جسارت" "ترک شراب" کی اس سازشی مہم میں دائیں بازو والوں کی "بھٹو دشمنی" کو نہ چھپا سکا۔ چنانچہ اُس نے امریکی جریدے "ٹائم" کے انٹرویو کا حوالہ دے کر ٹورنٹو کے مسلمانوں کی طرف سے بھٹو صاحب پر شیمپین کے کچھ چھینٹے اُڑائے ہیں۔

دائیں بازو کے تقریباً سارے ہی نام نہاد لیڈر اس پراپیگنڈے کا ڈھول پیٹ رہے ہیں کہ "یحییٰ خان کی شراب نوشی کے باعث آدھا پاکستان چھن گیا اور مغربی پاکستان کی سرحدوں پر بھارت کے ہاتھوں ذلت آمیز شکست اٹھانی پڑی۔"

جب تک یحییٰ خان برسر اقتدار رہا کسی بھی نام نہاد مذہبی لیڈر میں اتنی جرأت نہ ہوئی کہ اُسے ٹوک سکے یا شراب کے خلاف مہم چلائے۔

دلچسپ بات تو یہ ہے کہ دائیں بازو کے اسلام پسند لیڈروں کا پیرومرشد وزیر اطلاعات نواب زادہ شیر علی خان اسی شرابی یحییٰ خان کا معتمد خاص تھا۔ اس کی حیثیت "نائب صدر مملکت" جیسی تھی۔ اس نے صحافیوں، فلمی فنکاروں، ادیبوں اور دانشوروں پر تابڑ توڑ حملے کرکے ان کے ہاتھوں سے رزق کی رکابیاں تو چھین لیں لیکن یحییٰ خان کے ہاتھ سے شراب کا گلاس چھیننے کی جرأت نہ کر سکا۔ اس "شیر اسلام" نے بھی عام لوگوں کی شراب نوشی پر امتناع عائد کرنے کے خوب ڈھول پیٹے لیکن شرابی یحییٰ خان کے ساتھ سائے کی طرح لگے رہنے کے باوجود اس سب سے بڑے اسلام پسند وزیر میں اتنی جرأت نہ ہوئی کہ وہ اپنے شرابی آقا کے ہاتھ سے شراب کا جام چھین لے۔

وہ کابینہ کے ہر اجلاس میں شریک ہوتا، یحییٰ خان کی ہر دعوت ضیافت میں شرکت کرتا لیکن حیرت ہے کہ کسی بھی دعوت اور ضیافت میں اسے یحییٰ خان کی شراب نوشی پر اعتراض نہ ہوا۔

ظاہر ہے کہ اس "شیر اسلام" نواب زادہ شیر علی کو اسلام سے زیادہ کرسیٔ وزارت عزیز تھی۔ ورنہ وہ اگر سچا شیدائی اسلام ہوتا تو یحییٰ خان کے ہاتھ سے جام شراب چھین لیتا اور اسے سمجھاتا کہ:

"تم جام شراب میں سارے پاکستان کو ڈبو رہے ہو۔"

لیکن ان اسلام پسندوں میں اتنی جرأت کہاں؟ اور انہیں یحییٰ خان کی شراب نوشی پر اس لیے بھی اعتراض نہ تھا کہ یحییٰ خان ان کا آلہ کار اور وہ یحییٰ خان کے آلہ کار تھے۔

گزشتہ چوبیس برس سے (قائد اعظم سے قطع نظر) ہر رہنما اور ہر حکمران شراب پیتا چلا آیا ہے:

غلام محمد نشے میں دھت رہتے تھے، اسکندر مرزا ہمیشہ مخمور رہتے تھے، ایوب خاں بھی چسکی لگاتے تھے اور یحییٰ خان نے تو جیسے پانی کبھی بچپن میں پیا ہو تو پیا ہو۔

لیکن ان میں سے کسی کی بھی شراب نوشی پر انہیں اعتراض نہیں تھا کیونکہ ان سربراہان مملکت نے کسی اسلام پسند کو الیکشن میں نہیں ہرایا تھا۔ اور اب تو شراب نوشی تو شراب نوشی بے چارے بھٹو کو وقت پر روٹی کھانے کی بھی فرصت نہیں ملتی مگر اس کے باوجود دائیں بازو کے شکست خوردہ اور نام نہاد لیڈروں نے شراب کے بہانے بھٹو حکومت کے خلاف ایک سازشی گھناؤنی مہم شروع کر رکھی ہے۔

انہیں کوئی بتائے کہ دنیا کے ننانوے فیصد حکمران اور بڑی شخصیتیں شراب پیتی ہیں۔

چرچل سے بڑا شرابی شاید ساری دنیا میں کوئی نہیں تھا لیکن چرچل سے بڑا محبِ وطن اور رہنمائے قوم بھی برطانیہ میں نہ پہلے گزرا اور نہ آئندہ آئے گا۔

سوال یہ ہے کہ چرچل کے جام شراب میں برطانیہ کیوں نہ ڈوبا؟ صرف یحییٰ خان کے جام شراب میں پاکستان کیسے ڈوب گیا ——؟

شراب خراب ہے یا انسان ——؟ اگر شراب خراب ہے تو چرچل کے جام شراب میں بھی برطانیہ کو ڈوب جانا چاہیئے تھا۔ ماؤزے تنگ اور چو این لائی بھی شراب پیتے ہیں لیکن ان کی شراب نوشی کے باوجود چین دیکھتے ہی دیکھتے دنیا کی تیسری بڑی طاقت بن گیا ہے۔

دنیا کی دوسری بڑی طاقتوں کے سربراہ رچرڈ نکسن اور الیکسی کوسیجن بھی شراب پیتے ہیں مگر ان کی قومیں (امریکہ اور روس) چاند اور مریخ پر کمندیں ڈال رہی ہیں۔ آخر دنیا کے کس ملک کے لیڈر شراب نہیں پیتے! شراب انہیں یا ان کی قوم اور ملک کو کیوں تباہ نہیں کرتی صرف پاکستان کی کیوں دشمن ہے شراب ——؟؟

یہ بڑی شرارت ہے: شراب تو محض بہانہ ہے دراصل عوام کے ٹھکرائے ہوئے شکست خوردہ اسلام پسندوں نے نئی عوامی حکومت میں گڑبڑ اور بدنظمی پھیلانے کے لیے شراب کی بوتل کو نشانہ بنانا شروع کیا ہے۔

حالانکہ جماعت اسلامی کے ایکٹنگ امیر مولانا طفیل محمد

باقی صفحہ ۴۳ پر ملاحظہ فرمائیں



جنرل حبیب اللہ کی کہانی —— بابا عظیم گل ڈرائیور کی زبانی

کابل میں انگریزوں کے جاسوس

کرنل لارنس کا دستِ راست حبیب اللہ کا باپ تھا

باپ وزیر اور بیٹا جنرل کیسے بنا؟

محمد شاہد مجید

بابا عظیم گل کوہاٹ کے ایک نواحی گاؤں میں رہتے ہیں انگریزوں کے دور میں وہ ڈرائیور تھے۔ ان کی عمر کا بیشتر حصہ انگریز افسروں کے ساتھ ملازمت میں بسر ہوا۔ ان کی بوڑھی آنکھوں نے زمانے کے بہت سرد گرم دیکھے ہیں۔ ان کی زندگی ہماری قومی اور سیاسی تاریخ کا ایک ان لکھا باب ہے۔ آج کی صحبت میں اس ان لکھی تاریخ کے چند اوراق پیش کئے جاتے ہیں۔ جن کا تعلق لیفٹیننٹ جنرل حبیب اللہ سے ہے۔ حبیب اللہ جو سرحد کے ایک بڑے جاگیردار اور ملک کے بڑے سرمایہ دار ہیں۔ ان کا شمار ان بائیس خاندانوں میں ہوتا ہے۔ جن کا پاکستان کی قومی دولت پر قبضہ ہے۔ وہ سابق صدر ایوب خان کے سمدھی ہیں۔ علی قلی خان کے فرزند ہیں۔ یہ وہی علی قلی خاں ہیں جن کا ذکر انگریز تذکرہ نگاروں نے تاج برطانیہ کے فرزندانِ دل پسند کے ذیل میں خصوصیت کے ساتھ کیا ہے۔

جنرل حبیب اللہ فوج سے نکلے تو ایک ریٹائرڈ فوجی افسر تھے۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ ایک بڑے صنعت کار بن گئے۔ دولت ان کے قدم چومنے لگی۔ لیکن یہ راز آج تک افشا نہ ہوا کہ اُن کی اس راتوں رات ترقی کا باعث کیا ہے۔ کچھ لوگ اُسے ایوب خان سے ان کی رشتہ داری قرار دیتے ہیں۔ شاید یہ درست بھی ہے۔ لیکن اس کا سبب اور بھی ہے۔ اور وہ ہے ان کا خاندانی پس منظر۔ بابا عظیم گل نے اسی پر سے پردہ اٹھایا ہے۔ انہوں نے اپنی آنکھوں سے جو کچھ دیکھا، وہی بتایا ہے۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ ایک ملاقات میں، میں نے بابا عظیم گل سے باتوں باتوں میں پوچھا: "بابا آپ جنرل حبیب اللہ کو تو جانتے ہی ہیں۔ اُن کے بھائی یوسف خٹک کو بھی جانتے ہیں۔ وہ قومی اسمبلی کے ممبر بھی ہیں۔ یہ دونوں بھائی۔" انہوں نے مجھے اپنا جملہ پورا بھی نہ کرنے دیا۔ بیچ میں بول پڑے "ہاں میں اُن کے باپ علی قلی خان کو بھی جانتا ہوں۔ ٹھیک سے یاد نہیں پڑتا غالباً ۱۹۳۱ء کا ذکر ہے۔ میں ان دنوں خیبر کے پولیٹیکل ایجنٹ ایڈورڈ صاحب کا ڈرائیور تھا ایک دن ایڈورڈ صاحب، جو بڑی روانی سے پشتو بولتے تھے، دفتر میں بیٹھے تھے، سڑک کے دوسری طرف ایک فقیر آکر بیٹھا۔ نورانی چہرہ، لمبی داڑھی، سرخ سپید رنگ بہت سے لوگ اس سے فیض حاصل کر رہے تھے۔ مجھے ایڈورڈ صاحب نے اُس کے پاس بھیجا کہ اُسے صاحب کی طرف سے چائے کی دعوت دوں۔ بقول اُن کے وہ بھی اس سے فیض حاصل کرنا چاہتے تھے۔ میں نے پشتو زبان میں اس فقیر کو صاحب کی طرف سے چائے کی دعوت دی۔ اُس نے پشتو میں جواب دیا کہ "تمہارا صاحب انگریز ہے، کافر ہے۔ میں اس کے ساتھ چائے نہیں پی سکتا"۔ لیکن بڑی مشکل سے میں نے اُسے منت سماجت کر کے راضی کیا اور صاحب کے پاس لے آیا۔ چائے پینے کے بعد صاحب نے کہا کہ جاؤ فقیر بابا کو سرحد پر چھوڑ آؤ۔ یہ کابل جانا چاہتے ہیں۔ اور یوں فقیر بابا کابل چلے گئے۔ کافی عرصہ بعد معلوم ہوا کہ وہ پیر بابا آج کل ملا شور بازار کابل میں امامت کے فرائض انجام دیتا ہے اور اُس کے مریدوں کا حلقہ خاصا پھیل چکا ہے۔"

"۱۹۲۹ء کا ذکر ہے۔ کابل میں گڑبڑ کے بعد شاہ امان اللہ کو تخت چھوڑنا پڑا۔ ایک دن ایڈورڈ صاحب مجھ سے کہنے لگے کہ موٹر لے کر طورخم جاؤ۔ ان پیر بابا کے آنے کی خبر ملی ہے۔ انہیں لے آؤ۔ میں گاڑی لے کر گیا اور انہیں صاحب کے بنگلے پر لے آیا۔ دو دن بعد صاحب مجھ سے کہنے لگے ایک اور صاحب آئے ہیں انہیں گورنمنٹ ہاؤس لے جانا ہے۔ دوسرے دن جب میں نے اس اجنبی صاحب کو گاڑی میں بٹھایا تو مجھے اس کی صورت پہچانی پہچانی معلوم ہوئی۔ اب جو غور سے اس کی آنکھوں کی طرف دیکھتا ہوں تو وہی فقیر بابا تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ داڑھی مونچھیں صاف تھیں اور کوٹ پتلون میں ملبوس تھا۔ میں نے فقیر بابا سے جو اب صاحب بن چکا تھا پوچھا کہ "پیر بابا کل جب میں تمہیں طورخم سے لایا تو تمہاری صورت کچھ اور تھی۔ یہ ایک دو روز میں تم نے کیا کر دیا۔" وہ لہجہ بدل کر بولا۔ "WHAT" (کیا؟) میں نے کہا "اب تم what، what بولتے ہو کل خوب پشتو میں بولتے تھے۔ مجھے دھوکہ نہ دو، میری نظریں ابھی اس قدر کمزور نہیں ہوئیں کہ تمہاری آنکھیں بھی پہچان نہ سکوں۔"

اس پر وہ فوراً پشتو میں بولا۔ "تم مسلمان ہو۔"

میں نے کہا۔ "ہاں۔"

کہنے لگا۔ "کلمہ پڑھو۔"

"میں نے کلمہ پڑھا تو کہنے لگا تم نے غلط پڑھا ہے۔ محمدؐ کو زبر سے نہیں پیش سے پڑھتے ہیں۔"

"بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ وہ شخص پیر بابا نہیں بلکہ کرنل لارنس تھا۔ دراصل اس کرنل کو ایک گہری سازش کے تحت کابل بھیجا گیا تھا کہ عوام میں شاہ امان اللہ کے خلاف پروپیگنڈہ کرے۔ اُس نے وہاں امامت شروع کی۔ ایک اور انگریز میجر Rao اور شیخ محبوب علی جنہیں بعد میں نواب بنایا گیا۔ ان کی خفیہ معاونت کے فرائض انجام دیتے رہے۔ شاہ امان اللہ نے غالباً ۱۹۲۴ء میں دہلی کے ایک جلسۂ عام میں اعلان کیا تھا کہ وہ ہندوستان کو آزاد کرا کے دم لیں گے۔" بابا نے بتایا کہ وہ اگرچہ مغربی تہذیب کے حامی تھے لیکن انگریز سامراج کے سخت خلاف تھے اور غالباً اسی وجہ سے علامہ اقبالؒ ان کی بہت عزت کرتے تھے۔ چنانچہ انگریزوں نے اُن کے خلاف سازش تیار کی۔ کرنل لارنس کو پیر اور عالم دین بنا کر کابل بھیجا

کرنل لارنس کا "معجزہ" چٹکی خاک پھونک کر جنگ بند کرادی

گیا۔ اسے عالم دین انگریزوں نے اس لئے بنایا تھا کہ اس طرح مسلمانوں کو آسانی سے گمراہ کیا جاسکتا تھا۔

بابا عظیم گل نے مزید بتایا کہ جب کرنل لارنس کابل میں مقیم تھا۔ اسی دوران ہندوستان کی بارڈر فورسز اور افغانی فوج کے درمیان جنگ چھڑ گئی۔ انگریزوں نے رات کے دس بجے فائر بندی کرنے کا منصوبہ بنایا اور اس کی اطلاع دن ہی میں کرنل لارنس کو پہنچادی جو کابل کے مسلمانوں میں عالم دین سمجھا جاتا تھا۔ جب لارنس کو یہ خبر مل گئی تو اس نے کابل میں اپنے مریدوں کے سامنے یہ اعلان کیا کہ وہ محاذ جنگ پر جاکر ایک چٹکی خاک کی اٹھاکر دشمن کی جانب پھینکے گا اسی وقت جنگ بند ہوجائے گی۔ پھر ایسا ہی ہوا کرنل لارنس، عالم دین کے بہروپ میں محاذ کے قریب پہنچا۔ اُس نے اپنے پروگرام کے مطابق بہت سے لوگوں کی موجودگی میں زمین پر سے مٹی اٹھائی اور دشمن کی طرف ہاتھ اٹھاکر مٹی ہوا میں اڑا دی ہر طے شدہ منصوبے کے مطابق اچانک دشمن کی طرف سے فائرنگ بند ہو گئی۔ یہ وہی وقت تھا جو فائر بندی کے لئے مقرر کیا گیا تھا۔

غرضیکہ اس قسم کے مختلف شعبدے دکھاکر جب کرنل لارنس نے عوام کو اپنے اعتماد میں لے لیا تو انگریزوں کے ایجنٹ شیخ محبوب علی نے کچھ انگریز عورتوں کی برہنہ تصاویر میں ملکہ ثریا کا چہرہ سجادیا۔ ان عورتوں کو ایک سوئمنگ پول میں نہاتے ہوئے دکھایا گیا تھا۔ اس قسم کی چند تصاویر کی نمائش پر لوگ مشتعل ہوگئے اور کرنل لارنس نے عالم دین کی حیثیت سے امان اللہ خان کے خلاف "کافراست" کا فتویٰ صادر کردیا۔ انگریزوں نے موقع سے فائدہ اٹھایا اور اپنے پٹھو قبائلی سرداروں کو بچہ سقہ کی مدد کے لئے بھیجا۔ جس کی حیثیت اُس وقت محض ایک باغی ڈاکو کی تھی۔ لیکن ابھی یہ ڈرامہ مکمل نہیں ہوا تھا کہ نادر شاہ نے اُسے ناکام بنادیا۔"

تفصیل گو بہت دلچسپ تھی لیکن یہ میرے سوال کا جواب فراہم نہیں کرتی تھی۔ لہذا میں نے دوبارہ یاد دلایا۔ "بابا میں نے تو جنرل حبیب اللہ اور یوسف خٹک کے بارے میں پوچھا تھا"

بابا عظیم گل ہنس کر بولے "بھئی یہی تو اصل قصہ ہے۔ پہلے پوری بات تو سُن لو۔ دراصل امان اللہ خاں کے خلاف انگریزوں کی اس سازش میں حبیب اللہ اور یوسف خٹک کا باپ علی قلی خان کرنل لارنس کا دست راست تھا۔ وہ اس کے ساتھ ایک مرید کی طرح گیا تھا اور ہر وقت اس کے ساتھ اس طرح رہتا تھا۔ لوگوں سے مل کر اس کے لئے جاسوسی کرتا تھا۔ اس کی ہدایت کے مطابق لوگوں میں امان اللہ خاں اور اُس کی ملکہ کے خلاف طرح طرح کی افواہیں پھیلاتا تھا۔ پروپیگنڈا کرتا تھا۔ سرحد کے بعض لوگوں کے پاس آج بھی ایسی تصویریں موجود ہیں جو اسی زمانے کی ہیں۔ ان میں کرنل لارنس کسی عالم کی طرح نظر آتا ہے اور علی قلی خان اس کی خدمت میں مودب بیٹھا دکھائی پڑتا ہے۔ غرضیکہ انگریزوں کے اس خطرناک مشن کی کامیابی میں علی قلی خان کا زبردست ہاتھ تھا انگریز اس سے اس قدر خوش ہوئے کہ کابل سے واپسی پر انہوں نے علی خاں کو پشاور میں وزیر بنادیا۔ بہت بڑی جاگیر دی۔ تم جانتے ہو جب انگریز کسی کو نواب بنادیتے تھے تو اس کی نسلیں تک نواب اور جاگیردار بن جاتی تھیں۔ علی خان کی اسی خدمت کے سلسلے میں حبیب اللہ کو فوج میں کمیشن ملا۔ وہ جنرل بنا۔"

بابا عظیم کہنے لگا۔ "علی قلی کیا تھا؟ کوئی اس کا نام بھی نہ جانتا تھا۔ بہت معمولی آدمی تھا۔ انگریز کا خوشامدی تھا اور پٹھانوں کا دشمن تھا۔ جب وہ وزیر بن گیا تب بھی لوگ اس سے نفرت کرتے تھے۔ انگریز کا پٹھو کہتے تھے۔ مگر ظلم تو یہ ہے کہ پاکستان بنا تب بھی انگریز کا پٹھو اور ان کی اولاد حاکم رہی۔ آج یہ ہمارے ضلع کا سب سے بڑا خاندان کہلاتا ہے۔ ان لوگوں کے گھروں میں آج بھی انگریز افسروں کی تصویریں لگی ہیں۔ یہ اُن تصویروں کو پھولوں کے ہار پہناتے ہیں۔ یہ انگریزوں کی دوستی پر فخر کرتے ہیں"

"یہ کہتے کہتے بابا عظیم گل کا چہرہ اداس ہوگیا۔ انہوں نے دُکھ بھرے لہجے میں کہا۔ "پر یہ تمہارے بھٹو صاحب کو کیا ہوا۔ وہ غریبوں کی بات کرتا ہے۔ عوام کی بات کرتا ہے۔ اُس نے سرمایہ دار اور جاگیردار حبیب اللہ کو گرفتار کیا۔ پھر اُسے چھوڑ بھی دیا۔ وہ اور اس کا باپ تو سرحد کے پٹھانوں کے دشمن ہیں۔ حبیب اللہ کے کارخانے ضبط ہوتے، وہ بھی جیل کاٹتا تو عوام خوش ہوتے۔ بھٹو صاحب کس سے ڈر گیا ہے؟"

• میں خاموش رہا۔ کیا جواب دیتا۔ ویسے میرے پاس جواب ہی نہیں کیا۔

پردہ چاک

میجر آفتاب حسن - جامعہ کراچی کے "چانکیہ"

میجر آفتاب کو اردو کالج سے نکالنے کے لئے

بابائے اُردو کو عدالتی کارروائی کرنی پڑی

الفتح رپورٹ

میجر آفتاب حسن، جامعہ کراچی کے شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ کے ناظم ہیں۔ اساتذہ انہیں اپنی نجی محفلوں میں "چانکیہ" کہہ کر یاد کرتے ہیں۔ طلباء انہیں "داروغہ جامعہ" کہتے ہیں۔ وجہ تسمیہ اس کی یہ ہے کہ یہ شعبۂ تادیب کے بھی سربراہ ہیں۔ طلباء کے اخلاق و اطوار درست کرتے ہیں۔ ضرورت پڑنے پر غنڈوں کے ذریعے ان کی پٹائی بھی کراتے ہیں۔ زیادہ سرکشی کریں تو جیل کی ہوا کھلاتے ہیں۔ میجر آفتاب حسن، ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے دانشور بھی ہیں۔ یہ نئی بات کبھی نہیں کہتے ہمیشہ آموختہ سناتے ہیں۔ اور ریڈیو اور ٹیلی ویژن والے اس ریکارڈ کو بار بار چلاتے ہیں۔

جب تک ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی شیخ الجامعہ رہے جامعہ کراچی میں میجر آفتاب حسن کا طوطی بولتا تھا۔ ان دنوں ان کا فرض منصبی اسلامی جمعیتہ طلباء کو منظم کرنا، یونین کے انتخابات میں اُسے کامیاب بنانا اور این۔ ایس۔ ایف کے حامی طلباء کو جامعہ سے خارج کرانا اور شہر بدر کرانا تھا۔ سنا ہے اِس دور میں یہ بیک وقت دو تنخواہیں وصول کرتے تھے۔ ایک جامعہ سے اور دوسری جماعتِ اسلامی سے۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ اس "مالِ غنیمت" میں انہوں نے جامعہ کے دوسرے اساتذہ کو بھی شریک کرنا چاہا مگر بعض نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ وہ "مالِ حرام" میں حصہ دار بننا نہیں چاہتے۔

میجر آفتاب حسن کسی زمانے میں پاکستان آرمی کی کاکول اکیڈمی میں اعزازی میجر تھے اور شعبہ سائنس کے لیکچرار تھے۔ مگر زیادہ عرصہ نہ چل سکے، نااہل قرار دے دیے گئے۔ وہاں سے برطرف کئے جانے سے قبل انہوں نے بابائے اردو مولوی عبدالحق پر انجھر پھینکا۔ انہیں شیشے میں اُتارا۔

بابائے اُردو سے اُن کے پُرانے تعلقات تھے یعنی ریاست حیدرآباد دکن میں انہوں نے آفتاب صاحب کو علمی حلقوں سے متعارف کرایا تھا۔ یہ ان دنوں کا ذکر ہے جب کراچی میں اردو کالج کا قیام عمل میں آیا تھا۔ انجمن ترقی اُردو نے اپنا کام شروع کر دیا تھا۔ آفتاب صاحب نے مولوی صاحب سے گذارش کی کہ انہیں اُردو کالج میں سائنس پڑھانے اُردو اور قوم کی خدمت کرنے کا موقع دیا جائے۔ چنانچہ بابائے اردو نے انہیں اردو کالج کا پرنسپل بنا دیا۔ لیکن بابائے اُردو کو آخری عمر میں اُن کے ہاتھوں جو تکلیفیں اٹھانی پڑیں وہ ایسا المیہ ہے جس سے کون واقف نہیں۔ میجر آفتاب کو اُردو کالج سے نکالنے کے لئے بابائے اردو کو عدالتی کارروائی کرنا پڑی تب کہیں جا کر اُن سے پیچھا چھوٹا۔ سُنا ہے پھر بھی یہ انجمن کی سینکڑوں نایاب کتابیں اپنے ہمراہ لے گئے۔

اُردو کالج سے نکالے جانے کے بعد آفتاب حسن نے اپنے مقاصد کے لئے جامع کراچی کو تاکا۔ ڈاکٹر اشتیاق حسین سے مراسم بڑھائے۔ دونوں ایک ہی مکتبۂ فکر سے تعلق رکھتے ہیں۔ لہٰذا جلد ہی ایک جان دو قالب بن گئے۔ ڈاکٹر قریشی نے ان کے لئے شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ قائم کروایا اور اس پر بحیثیت ناظم موصوف کا تقرر براہِ راست عمل میں آیا۔ میجر آفتاب نے جلد ہی جامعہ کراچی کو بھی اُردو کالج کی طرح ذاتی مقاصد کے لئے استعمال کرنا شروع کر دیا۔ یہاں انہوں نے جو بدعنوانیاں کیں اُن کی مختصر تفصیلات یہ بیان کی جاتی ہیں۔

۱:۔ سائنس کی انگریزی کتابوں کا اُردو میں ترجمہ کرنے پر معاوضہ دینے کا طریقہ مقرر کیا گیا۔ یہ مقررہ معاوضہ ابتداء میں کسی مترجم کو نہیں دیا گیا بلکہ اکثر کتابیں صرف نمونے کے طور پر ترجمہ کروائی گئیں اور مترجمین کو دلاسا دیا جاتا رہا کہ ترجمہ اگر پسند آگیا تو آئندہ کتابوں کے ترجمہ پر معاوضہ دیا جائے گا۔ اِس طرح ہزاروں روپے ان مترجمین کے نام سے کمائے گئے۔

۲:۔ "جریدہ" کے نام سے ——— اصلاحات کا کتابچہ کم از کم سال میں چار بار شائع کرنے کا منصوبہ بنایا گیا۔ چنانچہ ہر مضمون میں وضع اصلاحات کے لئے ماہرین کی کمیٹیاں بنائی گئیں اور ماہرین کی ہر نشست کے لئے اُجرت مقرر کی۔ ہر کمیٹی کا اجلاس ہفتہ میں دو بار منعقد ہونا طے پایا۔ لیکن ہفتہ میں صرف ایک نشست ہوتی۔ ہر مضمون کی پوری ایک نشست کی رقم کہاں گئی۔ کسی کو اس کا علم نہیں۔ حالانکہ یونیورسٹی کو یہ باور کرایا گیا کہ ہفتہ میں ہر کمیٹی کی پابندی کے ساتھ دو نشستیں منعقد ہوتی ہیں۔ میجر آفتاب نے صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا۔ اصولی طور پر اصلاحات کی کمیٹی میں ماہر اساتذہ کو شریک کیا جانا چاہیئے تھا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا بلکہ چند ایسے ماہرین بلائے جاتے جو آفتاب صاحب کے اپنے آدمی ہوتے۔ بہت سے ماہرین جو واقعی یہ خدمت عمدگی اور مؤثر انداز میں انجام دے سکتے تھے۔ باوجود درخواستیں پیش کرنے کے نظر انداز کئے جاتے رہے۔ اس کے علاوہ ہر مضمون کی کمیٹی میں دو تین ماہر اساتذہ کے نام فرضی لکھے جاتے تھے اور اس کا تمام معاوضہ یاروں کی جیب میں جاتا۔ وضع اصلاحات کمیٹی کے ممبران کو علاوہ نشست کی اُجرت کے دورانِ اجلاس چائے وغیرہ بھی پیش کئے جانے کا انتظام تھا۔ لیکن اِس انتظام میں بھی آفتاب صاحب کی روزانہ کی چائے وغیرہ شریک کروائی جاتی تھی۔

۳۔ جامعہ کراچی میں خرید و فروخت کے لئے ایک باقاعدہ شعبہ قائم ہے۔ لیکن آفتاب صاحب کو اِس بات کا اختیار حاصل ہے کہ اپنے شعبے کے لئے جو چاہے براہِ راست خرید و فروخت کر لیں اور اس کے لئے شعبۂ حسابات سے رقم حاصل کر لیں۔ اِس طرح ہزاروں روپے کا سامان ہر سال خریدا جاتا۔ اس خرید و فروخت میں دونوں ہاتھوں سے کمایا گیا۔ خوب دل کھول کر دھاندلیاں کی جاتیں۔ بتایا گیا ہے کہ اکثر صرف بل منگوا لیا جاتا ہے اور جعلی رسید دیدی جاتی۔ شعبۂ حسابات سے اس کی رقم بھی حاصل کر لی جاتی۔ لیکن سامان کبھی نہ آتا۔ اکثر یہ بھی ہوا کہ ایک ہی مال کے کئی کئی بل دو دفعہ وقفہ سے پیش کر کے رقم حاصل کر لی جاتی۔ لیکن نہ تو شعبہ حساب کی جانب سے کبھی جانچ پڑتال ہوتی اور نہ ہی آڈٹ آفس نے کوئی

یونیورسٹی لائبریری کی سینکڑوں نایاب کتابیں میجر صاحب گھر لے آئے

توجہ دی۔ اس سلسلے میں جو دھاندلیاں ہوئیں ان کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ ایک معمولی کلرک جو پیڈی سی (اسٹور کیپر) اور جس کی تنخواہ مشکل سے تین سو روپے ہے۔ روزانہ نئے نئے سوٹ پہن کر آتا۔ اس کے گھر کا عالم یہ ہے کہ اس کا گھر ضروریات زندگی کے اعلیٰ قسم کے سازوسامان سے آراستہ ہے۔ ان اسٹور کیپر کے گھر پر ایک عدد ٹیلی فون بھی ہے۔

۴:۔ یونیورسٹی کی جانب سے شعبہ تصنیف و تالیف کو ایک مائکروبس دی گئی ہے۔ جو صرف سرکاری کام یعنی پریس سے چھپی ہوئی کتابیں اور پروف وغیرہ لانے لیجانے اور چھپائی کے سلسلے کے دوسرے کام کے لئے استعمال ہونی چاہیئے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ بس آفتاب حسن صاحب کی ذاتی ملکیت ہے۔ اس لئے کہ یہ گاڑی سرکاری کام تو بہت ہی کم کرتی ہے۔ دو، چار دن میں ایک بار پریس وغیرہ جاتی ہے لیکن آفتاب صاحب اور ان کے اہل خاندان کی تفریحات میں دن رات مصروف رہتی ہے۔ حد یہ ہے کہ رات کو بھی یہ گاڑی آفتاب صاحب کے گھر پر کھڑی رہتی ہے۔ رات کو خود وہ ڈرائیونگ کر کے اسے استعمال کرتے ہیں۔ اس کا تمام خرچ یونی ورسٹی برداشت کرتی ہے۔ گاڑی کی ڈیوٹی کی کاپی میں مصروفیات کی جو رپورٹیں درج کی جاتی ہیں ان کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

۵ :۔ یونی ورسٹی کی جانب سے آفتاب صاحب کے دفتر میں دو ٹیلی فون لوکل ہیں۔ ایک ٹیلی فون یونیورسٹی کے ایکسچینج کے ذریعہ کام کرتا ہے۔ اور دوسرا براہ راست باہر کے استعمال کے لئے لگایا گیا ہے۔ اسی طرح ایک ٹیلی فون کیمپس میں ان کے مکان میں لگا ہے۔ یہ سہولتیں اس لئے فراہم کی گئی ہیں کہ سرکاری کام جلد سے جلد انجام پا سکے۔ لیکن ان تینوں ٹیلی فونوں کی مصروفیت کی کیفیت یہ ہے کہ پوری یونی ورسٹی میں کوئی ٹیلی فون اتنا مصروف نہیں رہتا۔ جتنے یہ ٹیلی فون رہتے ہیں۔ اور یہ ٹیلی فون صرف کراچی شہر میں بات کرنے کے لئے استعمال نہیں ہوتے بلکہ ان کے ذریعے پورے مغربی پاکستان سے براہ راست بات چیت کی جاتی ہے۔ اس بات چیت کا سلسلہ خصوصیت سے سائنٹیفک سوسائٹی آف پاکستان کی سالانہ کانفرنس سے دو تین ماہ پہلے سے یعنی ستمبر سے دسمبر تک بہت زیادہ رہتا ہے۔ یہ ساری گفتگو ذاتی نوعیت کی ہوتی ہے اور سوسائٹی کے متعلق کم ہوتی ہے لیکن اس کا سارا بل یونی ورسٹی ادا کرتی ہے۔ البتہ اس میں آفتاب صاحب نے اپنے دفاع کے لئے یہ انتظام کر رکھا ہے کہ ہر ماہ سائنٹفک سائٹی کی طرف سے پچاس روپے ٹیلی فون بل ادا کرتے ہیں۔ حالانکہ ٹیلی فون کا خرچ ہر ماہ سینکڑوں روپے تک جاتا ہے۔

۶۔ یونیورسٹی کا ایک ملازم روح الامین جواب مشرقی پاکستان چلا گیا ہے۔ گذشتہ آٹھ سال سے آفتاب صاحب کے گھر میں خانساماں کا کام کرتا رہا اور تنخواہ یونی ورسٹی سے پاتا رہا۔ اس نے کبھی یونی ورسٹی کے لئے کوئی خدمت انجام نہیں دی۔

۷ :۔ آفتاب حسن صاحب یونی ورسٹی لائبریری سے سینکڑوں کی تعداد میں اہم اور نایاب کتابیں اپنے گھر لے گئے ہیں لائبریری سے بارہا واپسی کے مطالبے کے باوجود واپس نہیں کرتے۔ ٹال مٹول کر جاتے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مئی ۷۲ء میں جب ان کی مدت ملازمت ختم ہو جائے گی تو یہ خاموشی سے گھر چلے جائیں گے اور شاید ان سے کتابوں کے بارے میں کوئی خاص نوٹس بھی نہیں لیا جائے کیونکہ لائبریرین ڈاکٹر معید صاحب موصوف کے خاص قسم کے دوستوں میں ہیں۔ اسی طرح آفتاب صاحب شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ کی لائبریری سے بھی اہم اور نایاب کتابیں اپنے گھر لے گئے ہیں۔ ان میں سے اکثر کتابیں جو انہوں نے اپنے پاس محفوظ کر لی ہیں انہیں سابق مددگار ناظم شن ضحی مرحوم کے نام میں درج کروا دیا گیا ہے۔

۸ :۔ مطبوعات کی چھپائی کے لئے کاغذ اور دوسرا سامان نوکھا ٹریڈنگ کارپوریشن سے خریدا جاتا ہے۔ اس میں کس کا کتنا کمیشن ہے۔ اس بات کا جامعہ میں اکثر چرچا ہوتا ہے۔ اگر کبھی کاغذ اس کمپنی میں موجود نہیں ہوتا۔ تب بھی اسی کے ذریعہ بازار سے خریدا جاتا ہے۔ اسے مفت میں کمیشن دیا جاتا ہے۔

۹ :۔ اسی طرح مطبوعات کی چھپائی کے لئے صرف ٹکنیکل پرنٹرز، ٹائمز پریس اور انٹر سروسز پریس کے علاوہ کسی پریس کو کام نہیں دیا جاتا ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ شہر کے دوسرے چھاپے خانوں نے کم اجرت اور زیادہ سہولتیں فراہم کرنے کی پیش کش کی۔ مگر ان پر کبھی توجہ نہ دی گئی۔ کیوں۔ ؟ یہ راز آفتاب حسن صاحب زیادہ جانتے ہیں۔

یہ تو ہوا اس شعبے کا حال جس کے میجر آفتاب حسن ناظم ہیں۔ بارے کچھ ذکر سائنٹیفک سوسائٹی کا بھی ہو جائے کہ یہ بھی آفتاب کی ایک جاگیر ہے جس پر ان کی حکمرانی کا سکہ چلتا ہے۔ یہ سوسائٹی میجر صاحب کے زیر انتظام گذشتہ ۲۰ سال سے قائم ہے۔ اس کے بارے میں باخبر حلقوں سے جو اطلاعات ملی ہیں ان کے مطابق سائنٹیفک سوسائٹی آف پاکستان کے عہدہ داروں اور مجلس منتظمہ کے انتخابات ہر برس سالانہ کانفرنس کے اختتام پر ہوتے ہیں۔ لیکن آفتاب صاحب کا ایک مخصوص گروپ ہے جو علیحدہ کمرہ میں پہلے ہی یہ طے کر لیتا ہے کہ کس کو منتخب کیا جائے کس کو ناکام بنایا جائے۔ چنانچہ طے شدہ پروگرام کے مطابق اپنے حلقے کے صدر اور دیگر عہدہ داروں کو منتخب کر لیا جاتا ہے۔ لیکن سوسائٹی کے جنرل سیکرٹری ہمیشہ میجر آفتاب حسن اور جوائنٹ سیکرٹری سید حامد محمود صاحب گذشتہ ۲۰ سال سے اپنے عہدوں پر قائم و دائم ہیں۔ ان دونوں کو کوئی ہٹا نہیں سکا سوسائٹی کے تمام حسابات اور لین دین کے لئے چیکوں پر یہی دونوں حضرات دستخط فرماتے ہیں۔ کیا آتا ہے اور کیسے خرچ ہوتا ہے۔ اس کا محاسبہ کبھی نہیں کیا جاتا۔ بہرحال اس کی کچھ تفصیلات یہاں پیش کی جاتی ہیں۔ ملاحظہ ہوں۔

۱:۔ سائنٹیفک سوسائٹی کی فیس رکنیت پانچ روپے اور سالانہ فیس دس روپے ہے۔ اس کے علاوہ ہر سال سالانہ کانفرنس کے موقعہ پر با اثر لوگوں سے جو رقم عطیے کے طور پر وصول کی جاتی ہے۔ وہ ہزاروں روپیہ بنتی ہے۔

۲۔ سوسائٹی ایک سائنسی رسالہ "جدید سائنس" دو ماہی نکالنے کا اعلان کرتی ہے۔ لیکن سال بھر میں مشکل سے بجائے چھ رسالوں کے چار نکال پاتی ہے۔ اس رسالے کی سالانہ فیس دس روپے ہے۔ یہ آمدنی بھی سال بھر میں ہزاروں روپیہ تک پہنچتی ہے۔ لیکن رسالے کی لکھائی چھپائی اور کاغذ کی خریداری پر سوسائٹی خود کوئی پیسہ خرچ نہیں کرتی بلکہ اس کا سارا خرچ مرکزی ترقی اردو بورڈ لاہور سے بطور امداد ملتا ہے۔ بورڈ کو یہ باور کرایا جاتا ہے کہ عوام اور سائنس کے طلباء و اساتذہ کو یہ رسالہ مفت تقسیم کیا جاتا ہے۔ چنانچہ اردو بورڈ محض علم پروری کے مد نظر یہ امداد فراہم کرتا ہے۔

۳۔ رسالہ "جدید سائنس" میں اشتہارات حاصل کرنے کے لئے بڑے بڑے صنعت کاروں سے رجوع کیا جاتا ہے۔ اور انہیں بھی یہی باور کرایا جاتا ہے کہ مفت تقسیم ہونے والے اس سائنسی اور علمی رسالے میں اشتہار دے کر اور اس کے لئے مالی امداد فراہم کر کے وہ قوم کی ایک عظیم خدمت کر رہے ہیں۔ اس طرح ایک بڑی رقم حاصل کی جاتی ہے۔

۴۔ ہر سال دسمبر کے آخری ہفتہ میں سائنٹیفک سوسائٹی کی سالانہ کانفرنس ملک کے کسی اہم شہر میں منعقد ہوتی۔ جس کا انتظام کوئی نہ کوئی اہم تعلیمی ادارہ کرتا ہے۔ مثلاً یہ کانفرنس

میجر آفتاب حسن کی گاڑی کا خرچ یونیورسٹی برداشت کرتی ہے

۱۹۶۶ء میں زرعی یونیورسٹی لائلپور میں ۱۹۶۷ء میں پنجاب یونیورسٹی میں ۱۹۶۸ء میں، پی ای سی ایچ ایس فاؤنڈیشن کالج کراچی میں ۱۹۶۹ء میں ادارہ تحقیقات زراعت لائلپور میں منعقد ہوئی۔ اب ۱۹۷۰ء کی کانفرنس مارچ ۱۹۷۲ء میں کراچی یونیورسٹی میں منعقد ہونے والی ہے۔ اس کانفرنس پر تقریباً چالیس ہزار روپے خرچ ہوتا ہے اور یہ تمام خرچ میزبان ادارہ برداشت کرتا ہے۔ میزبان ادارہ اخراجات کا کچھ حصہ خود برداشت کرتا ہے اور کچھ حصہ متعلقہ شہر کے مالدار اور مخیر لوگوں سے بطور امداد وصول کیا جاتا ہے۔ اِن اخراجات میں سائنٹیفک سوسائٹی کوئی حصہ نہیں لیتی، بلکہ ہزاروں روپے جو بطور امداد اور ممبروں سے فیس کے طور پر وصول کئے جاتے ہیں۔ ان میں سے بھی اس مد پر کچھ خرچ نہیں کیا جاتا۔ دوسرے اخراجات کا یہ عالم ہے کہ مقالات وغیرہ کی چھپائی کراچی یونیورسٹی کے شعبہ تصنیف و تالیف کی چھپائی کے مشینوں پر ہوتی ہے۔ اِس سلسلے میں جو خرید و فروخت کے اخراجات ہوتے ہیں۔ وہ بھی یونیورسٹی برداشت کرتی ہے۔ یہ اخراجات عام طور پر چار پانچ ہزار روپیہ سے زیادہ نہیں ہوتے۔

۵۔ ہر برس سالانہ کانفرنس میں بہت زیادہ اخراجات ہونے کا ڈھول پیٹا جاتا ہے۔ اِس کے لئے آفتاب صاحب ملک کے بڑے بڑے صنعت کاروں، تاجروں، تعلیمی اداروں، سائنسی و تحقیقی اداروں، بینکوں، عوامی اداروں مثلاً کراچی میونسپل کارپوریشن وغیرہ۔ حد یہ ہے کہ صوبائی و مرکزی حکومتوں سے بھی ہزاروں روپے کی امداد وصول کرتے ہیں۔ یہ رقم تقریباً ڈیڑھ لاکھ روپے تک پہنچ جاتی ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ کانفرنس کے تمام اخراجات میزبان ادارہ برداشت کرتا ہے۔

۶۔ آفتاب صاحب سال بھر میں اہل علم، اہل ثروت اور سرمایہ داروں سے یہ کہہ کر رقم بطور امداد وصول کرتے رہتے ہیں کہ سوسائٹی والے پاکستان کو سائنس اور ٹکنالوجی میں ترقی دینا چاہتے ہیں۔ اِس ترقی کے لئے سائنس کو اردو زبان میں عام کرنے کے لئے کتابیں لکھتے ہیں۔ لیکن فنڈ نہ ہونے کے سبب وہ مجبور ہیں۔ لہٰذا سوسائٹی کی مدد کی جائے۔ گذشتہ ۲۰ سال سے اس طرح لاکھوں روپیہ قوم سے وصول کیا جا چکا ہے۔ حالانکہ اب تک صرف ایسی پانچ معمولی سائنسی کتابیں شائع کی گئی ہیں جن کی چھپائی وغیرہ کے بیشتر بل اب تک ادا نہیں کئے گئے۔

۷۔ سائنٹیفک سوسائٹی کا سارا دفتری کام یونیورسٹی کے شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ میں ہوتا ہے۔ اِس طرح اس مد پر خرچ ہونے والی رقم بھی بچالی جاتی ہے۔ سوسائٹی کا کام خصوصیت سے کانفرنس کے انعقاد سے ۳، ۴ ماہ پیشتر شروع ہو جاتا ہے ویسے شعبہ کے اردو ٹائپسٹ اور اسٹینو ٹائپسٹ زیادہ تر سوسائٹی کے کام میں ہی مصروف رہتے ہیں۔ ان بے چاروں کی میزوں پر ہر وقت سوسائٹی کے کاغذات پھیلے نظر آتے ہیں۔ خصوصاً اُردو ٹائپسٹ اور اردو سٹینو ٹائپسٹ اگر سوسائٹی کے کام سے اجتناب برتیں تو انہیں نقصان پہنچایا جاتا ہے۔ اسی لئے ان کی جان ہر وقت عذاب میں رہتی ہے۔ چنانچہ آفتاب صاحب کے اُردو اسٹینو ٹائپسٹ گذشتہ پانچ سال سے اسی پریشانی میں مبتلا ہیں۔ اسٹینو کی پریشانی گزشتہ تین سال سے ایک عذاب بنی ہوئی ہے۔ یہ غریب کو جو اپنے متعلقہ فرائض پوری محنت اور دیانت داری سے انجام دینے کے بعد سوسائٹی کا کام زبردستی کرتا ہے اور جب کبھی سوسائٹی کے کام سے گریز کرتا ہے تو اسے سزا ملتی ہے۔ چنانچہ اس کی ترقی جو ۱۹۶۹ء میں ہونے والی تھی، روک دی گئی۔ حد یہ ہے کہ گذشتہ ۲ سال سے اِس غریب کا سالانہ اضافہ بھی غلط سالانہ رپورٹ لکھ کر روک دیا گیا۔ اس غریب اسٹینو

رسالہ 'جدید سائنس'
کے ذریعے صنعتکاروں
سے بھاری رقمیں
وصول کی گئیں

نے بڑے دُکھ کے ساتھ بیان کیا کہ جون ۱۹۶۹ء سے اب تک یعنی ۱۹۷۲ء تک اس کے تمام حقوق دبائے رکھنے کی وجہ سے ماہانہ ایک سو دس روپے کا نقصان پہنچایا جا رہا ہے۔

۷۔ آفتاب حسن صاحب کی مدت ملازمت مئی ۱۹۷۰ء میں ختم ہو گئی تھی۔ لیکن سابق وائس چانسلر ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی نے ان کی "اسلام پسندی" کے بدلے انہیں مزید ایک سال کی توسیع دلا دی۔ چنانچہ اب آفتاب صاحب مئی ۱۹۷۲ء میں یونیورسٹی کی ملازمت سے سبکدوش ہو جائیں گے لیکن آفتاب صاحب نے ملازمت سے سبکدوشی سے چند ہی روز قبل یونیورسٹی کے علاقہ میں ۵ ہزار گز زمین سائنٹیفک سوسائٹی کے دفتر کے نام پر بطور امداد بغیر کسی قیمت کے حاصل کر لی ہے۔ حالانکہ یہ زمین صرف ذاتی ہاؤسنگ کے لئے حاصل کی گئی ہے۔ صرف نام کی حد تک سوسائٹی کو استعمال کیا گیا ہے۔ سنا ہے کہ اس پر عمارت بھی یونیورسٹی سے امداد حاصل کر کے بنائی جائے گی۔ آفتاب صاحب آج کل اسی کوشش میں مصروف ہیں۔

اِس کے علاوہ سائنٹیفک سوسائٹی کے اسی دفتر کے نام سے کراچی شہر میں بھی ایک عمدہ پلاٹ کسی موزوں اور تجارتی مرکز میں کراچی میونسپل کارپوریشن سے حاصل کرنے کی کارروائی جاری ہے۔ صرف یہی نہیں، سائنٹیفک سوسائٹی کے دفتر کے نام سے محکمہ اوقاف و کسٹوڈین سے بھی ایک عمدہ عمارت الاٹ کرانے کی کارروائی جاری ہے۔ اِس سلسلے میں جو اطلاعات ملی ہیں ان کے مطابق یہ عمارت حیدرآباد ہاؤس جس میں مرحوم گورنر جنرل غلام محمد کے دور میں وزارت خارجہ کا دفتر تھا اور جو کلفٹن پر واقع ہے۔ اس عمارت کا آفتاب صاحب اور اُن کے خاص اہل کار معائنہ بھی کر چکے ہیں۔ اور ان کا سروے بھی ہو چکا ہے۔ اس عمارت کو حاصل کرنے کی بھرپور کوشش ہو رہی ہے۔

دل چسپ بات یہ ہے کہ سائنٹیفک سوسائٹی کا ایک مختصر سا دفتر جو گزشتہ ۲۰ سال سے جامعہ کراچی میں شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ کے صرف ایک کمرہ میں ہے اب اس کے دفتر کے نام پر ایک ہی شہر میں تین مقامات پر بڑی بڑی زمینیں اور عالیشان عمارت حاصل کرنے کی جد و جہد ہو رہی ہے۔

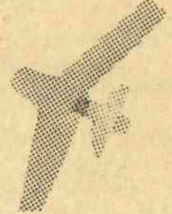
۸۔ آفتاب حسن صاحب مختلف طریقوں سے سوسائٹی کے نام پر لاکھوں روپے صوبائی اور مرکزی حکومتوں سے حاصل کر چکے ہیں۔ سنا ہے کہ یونائیٹڈ بنک، نیشنل بنک اور حبیب بنک میں ۵۰ ہزار روپیہ سیف ڈیپازٹ محفوظ ہے۔ باقی رقم کا کسی کو کوئی علم نہیں۔ لطف یہ کہ اس رقم پر کوئی ٹیکس بھی نہیں لیا جاتا ہے۔

۹۔ سائنٹیفک سوسائٹی کے حسابات کی آج تک کبھی حکومت کی کسی آڈٹ پارٹی نے جانچ پڑتال نہیں کی۔ بلکہ آفتاب حسن صاحب ایک آڈیٹر کو ۱۵۰/- روپے ماہانہ تنخواہ دیتے ہیں۔ یہ آڈیٹر کسی آڈٹ کمپنی کا ملازم ہے، جو حسابات تیار کرتا ہے اور اسی کا بنایا ہوا حساب آڈٹ اکاؤنٹ کہلاتا ہے۔

غرضیکہ یہ ہیں میجر آفتاب حسن جنہیں مختلف ناموں سے یاد کیا جاتا ہے اور جن کے کارنامے جامعہ کراچی کی ایک عبرت ناک داستان ہے۔

سازشیں ہی سازشیں





سوئی فیلڈ کا "

بھارتی طیارے ب

پُلوں کی تصویر بنانے والا انگریز

نومبر ۱۹۷۱ء کا آخری ہفتہ تھا۔ مشرقی پاکستان بھارتی جارحیت کی زد میں تھا۔ صورتِ حال انتہائی نازک اور سنگین ہو چکی تھی۔ بی او سی لندن کے ڈپٹی چیئرمین ڈاکٹر سیشن اور بی او سی کے ڈائرکٹر مسٹر جارج ولیم اچانک پاکستان پہنچ گئے۔ انہوں نے سوئی گیس کی اہم تنصیبات اور مختلف اسٹیشنوں کا معائنہ کیا۔ انہوں نے رودہڑی ہیڈکوارٹر نمبر ۱ کا بھی دورہ کیا۔ ایوب برج پر تعینات ایک پولیس مین نے انہیں اس وقت اپنی گرفت میں لیا جب وہ دونوں پل کی تصویریں اتارنے میں مصروف تھے۔ ان دونوں کو پولیس کی تحویل میں دے دیا گیا۔ مگر بی او سی کے لیبر افسر مسٹر نواب حسین غیر قانونی ذرائع اختیار کرتے ہوئے ان دونوں کو رہا کرانے میں کامیاب ہو گئے۔ اس طرح غیر ملکی عہدے داروں کیخلاف ملکی قانون کے مطابق کوئی کارروائی نہ کی گئی۔ ساتھ ہی انہیں پل کی تصاویر کے ساتھ باہر جانے کی اجازت بھی دے دی گئی۔

یہ ایک ناقابلِ معافی جرم تھا۔ ملک اور قوم سے غداری تھی۔ اس بدترین قومی جرم میں ملوث مقامی افراد کے ساتھ کیا کارروائی کی گئی۔ اس کا آج تک پتہ نہ چل سکا۔

حالیہ پاک بھارت جنگ کے دوران بھارتی ہوابازوں نے پاکستان کی بعض اہم اور حساس تنصیبات پر بار بار حملے کئے۔ ان حملوں کے پیچھے سازشوں کا ایک جال بچھا دیا گیا تھا۔ جنگ ختم ہونے کے بعد آہستہ آہستہ حقائق سے پردہ اٹھتا جا رہا ہے۔ غیر ملکی جاسوسوں اور دشمنوں سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ البتہ اپنے بعض ہم وطنوں کی وطن دشمنی اور غداری پر پوری قوم انگشت بدنداں ہے۔ وطن میں رہتے ہوئے وطن سے غداری کی بدترین مثال قائم کر دی گئی۔ پاکستان کی اہم تنصیبات اور پلوں پر بھارتی حملوں سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ جنگ سے قبل غیر ملکی ایجنٹوں اور وطن دشمنوں کو ملک دشمنی کی پوری اجازت دے دی گئی تھی۔ وہ ملک کے قوانین کی دھجیاں اڑاتے ہوئے پورے ملک میں دندناتے پھرے اور اپنے منصوبے کے مطابق اہم اسٹیشنوں اور تنصیبات کے فوٹوگراف اتارنے میں کامیاب ہو گئے۔ انہیں روک ٹوک کرنے والا کوئی نہ ملا۔ اگر ان میں بعض غیر ملکی ایجنٹ پکڑے گئے تو انہیں غیر قانونی ذرائع سے چھڑا دیا گیا۔

جنگ سے قبل ملک کے اندر غیر ملکی ایجنٹوں اور وطن کے غداروں نے سازشوں کا جو بھیانک جال پھیلا رکھا تھا۔ اس کے بارے میں چند انتہائی اہم اور سنسنی خیز انکشافات کئے گئے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ بی او سی کے ڈپٹی چیف نمائندہ مسٹر آر ڈی مینی ۱۰ دسمبر ۱۹۷۱ء کو پاکستان سے لندن کے لئے روانہ ہوئے۔ وہ اپنے ساتھ سوئی گیس کی اہم تنصیبات، ٹرانسمیشن لائنز اور روٹوں کی بے شمار تصویریں اور پلان اپنے ساتھ لے گئے۔ اس بات کا بھی انکشاف کیا گیا ہے کہ یہ ساری چیزیں، سوئی گیس ٹرانسمیشن کمپنی کے ڈپٹی جنرل منیجر مسٹر جے اے بینٹ نے بہم پہنچائی تھیں۔

ایک محبِ وطن نے قبل از وقت اس بات کی نشان دہی کر دی تھی کہ ان اہم دستاویزات کو بھارتی حکام کے حوالے کر دیا جائے گا۔ تاکہ بھارتی جنگ کے دوران سوئی گیس کی تنصیبات کو بم کے ذریعہ اڑانے کا منصوبہ آسانی سے پورا کر سکیں۔ بعد کے حالات نے اس محبِ وطن کے خدشات سو فی صد درست ثابت کر دیے۔

بھارتی ہوا باز ۱۴ دسمبر سے لے کر ۱۶ دسمبر تک یعنی مسلسل تین روز سوئی گیس کی تنصیبات کو نشانہ بناتے رہے۔ اس بات سے حکام آگاہ ہوں گے۔ ان تنصیبات کے علاقے دور دراز ہیں اور ایسی جگہوں میں نہیں ہیں۔ جنہیں بار بار اور آسانی سے نشانہ بنایا جائے۔ ان تنصیبات کو فوٹوگراف، پلان اور روٹوں کے نقشوں کے بغیر نشانہ بنانا بھارتی ہوابازوں کے بس کی بات نہیں تھی۔

جنگ کے دوران بھارتی ہوابازوں نے سوئی کے علاقوں میں متعدد بار ہوائی حملے کئے۔ مگر ۱۵ دسمبر ۱۹۷۱ء تک کسی قسم کے حفاظتی اقدامات نہیں کئے گئے۔ حالانکہ مغربی پاکستان میں یہ اہم علاقے ہیں۔ یہ بھی پتہ چلا ہے کہ سوئی فیلڈ کے منیجر کو ہدایت کی گئی تھی کہ سوئی فیلڈ کو ۲۴ گھنٹے بیکن (Becon) رکھا جائے۔ بیکن ایک قسم کا ٹرانسمیٹر ہے جو سوئی فیلڈ میں طیاروں کی آمد اور روانگی اور ان کی سمتوں کا سگنل دیتا ہے۔ اس سے اس وقت کام لیا جاتا ہے جب شیڈول کے مطابق طیارہ کی آمد اور روانگی متوقع ہوتی ہے۔ لیکن جنگ کے دوران اس ہدایت کی کھلی خلاف ورزی کرتے ہوئے بیکن سے ۲۴ گھنٹے کام لیا جاتا رہا۔ اس کا مقصد یقیناً دشمن کے طیاروں کی رہبری تھی تاکہ بھارتی ہوا باز ان اہم تنصیبات کو بم سے اڑانے میں کامیاب ہو جائیں۔

۱۰ دسمبر کو بھارتی ہوابازوں نے پہلی بار سوئی فیلڈ کو نشانہ بنایا۔ اس حملے میں چار افراد شہید ہوئے اور تقریباً ۵ افراد شدید طور

سوئی گ

صاحبزا

اور داماد

یکن" سگنل دیتا رہا اور

م برساتے رہے

فسر تصویروں سمیت لندن پہنچ گیا

عیم آروی

پر مجروح ہوئے۔ حملہ سے چند منٹ پیشتر ٹیلی فون کے ذریعہ اطلاع دی گئی۔ "پاکستان ایئر فورس کے چند طیارے سوئی فیلڈ کے اطراف میں پرواز کر رہے ہیں۔ بتایا جاتا ہے کہ یہ ٹیلی فون سول ڈیفنس آفس کی طرف سے کیا گیا تھا۔ کسی نے اس کال کی تصدیق کی ضرورت محسوس نہ کی۔ اور اس پیغام کو اُسی طرح سوئی فیلڈوں کو روانہ کر دیا گیا۔ اس پیغام کو کراچی ٹرمینل (سوئی گیس) کے ڈیوٹی افسر نے ریکارڈ کیا تھا۔ پیغام کے موصول ہونے کے چند منٹوں کے بعد سوئی کے علاقوں میں جنگی طیارے منڈلانے لگے۔ مگر یہ طیارے پی اے ایف کے نہ تھے بلکہ یہ انڈین ایئر فورس کے جنگی طیارے تھے۔ انہوں نے آتے ہی بمباری شروع کر دی۔ جس میں چار افراد ہلاک اور پانچ افراد زخمی ہو گئے۔

سوئی پر اُسی دن دوسری بار حملہ ہوا۔ بھارتی طیاروں نے ۶۰ وزنی بم گرائے۔ جس کی وجہ سے سوئی کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا۔ حملہ کا سلسلہ یہیں ختم نہ ہوا بلکہ ۱۶ر دسمبر ۱۹۷۱ر کو تیسری بار حملہ کیا گیا۔ یہ ہوائی حملہ پہلے سے زیادہ بڑا تھا۔ گیس پیوری فیکیشن پلانٹ اور کنڈنسنٹ پلانٹ دھماکے سے مکمل طور پر تباہ ہو گئے۔

ہوائی حملے سے پیوری فیکیشن پلانٹ کو جو نقصان پہنچا، اُسے سوئی گیس کے اسٹاف نے اپنے ہاتھوں مرمت کر لیا لیکن بی او سی کمپنیوں کے گروپ نے چیف کنٹرولر کو پلانٹ کی مرمت کے لئے ۳۰ لاکھ روپے کا سامان باہر سے منگوانے کی درخواست روانہ کر دی۔ اس کے علاوہ اس کی مرمت کے کام کی نگرانی کے لئے لندن کی ایک کمپنی فلوز لمیٹڈ اور برما آئل کمپنی لندن کے ٹیکنیکل ماہرین کی خدمات بھی حاصل کی جا رہی۔ جہاں تک مرمت کا سوال ہے تو اس کام کو پاکستانی ماہرین نہایت خوش اسلوبی اور فنی مہارت کے ساتھ مکمل کر چکے ہیں۔ پلانٹ تسلی بخش طریقے سے اپنا کام کر رہا ہے۔ کمپنی جان بوجھ کر کم مقدار میں گیس سپلائی کر رہی ہے۔ تاکہ وہ اپنے بے جا اصراف اور غیر ملکی ماہرین کو بلوانے کے مطالبے کو جائز قرار دے سکے۔ پلانٹ مکمل طور پر ٹھیک ہو چکا ہے۔ اس بات کی تصدیق مشین ٹولز فیکٹری (ڈبلیو پی آئی ڈی سی) لانڈھی کے مقامی ٹیکنیکل ماہرین سے کرائی جا سکتی ہے۔

نواب شاہ میں کمپریشر اسٹیشن قائم کئے گئے۔ جھوٹ کا سہارا لے کر کہا جاتا ہے کہ ٹرانسمیشن لائن دباؤ برداشت نہیں کرتی۔ اس جھوٹ کی آڑ لے کر امریکہ کی ایک کمپنی گلف انٹرنیشنل سے پرلے کمپریشر انجن منگوائے گئے۔ لاکھوں روپے کا غیر ملکی زرمبادلہ تباہ کیا گیا۔ اس بات کا انکشاف گلف انٹرنیشنل کے ایک ایماندار ماہر نے کیا۔ اُس نے اس بات کا وعدہ بھی کیا ہے کہ اگر حکومت پاکستان نے اس بات کی تصدیق کرنی چاہی تو وہ یہاں آ کر سب کچھ بتا سکتا ہے۔ اس ایکسپرٹ کا نام مسٹر کٹلے ہے۔ اُس نے بتایا کہ وہ حکومت کو اس مشینی معاملے سے آگاہ کرنا چاہتا تھا۔ مگر گرفتاری کی دھمکی دے کر بی او سی کے حکام نے اُسے زبردستی واپس بھیج دیا۔

چیف انسپکٹر ایکسپلوسیو مسٹر طفیل چوہدری اپنے خاندان کے نو افراد کے ساتھ ۱۶ر جنوری ۱۹۷۲ء کو سوئی پہنچے۔ اُن کی فلائٹ کا نمبر پی۔ کے۔ ۴۰۵ ہے۔ ان کے سفر اور ۱۶ر جنوری سے لے کر ۱۸ر جنوری تک کے تمام اخراجات سوئی گیس ٹرانسمیشن کمپنی نے برداشت کئے۔ مسٹر طفیل اپنے خاندان کے نو افراد کے ساتھ فلائٹ نمبر پی کے۔ ۵۰۵ سے ۱۸ر جنوری ۱۹۷۲ء کو کراچی واپس پہنچے۔ واپسی کے تمام انتظامات اور اخراجات کمپنی نے ادا کئے۔ کمپنی نے یہ کام چیف انسپکٹر کو خوش کرنے کے لئے کیا، تاکہ باہر سے سامان اور غیر ملکی ماہرین کو منگوانے میں کسی قسم کی رکاوٹ پیش نہ آئے۔

کمپنی عرصہ دراز سے اعلیٰ افسروں اور اثر و رسوخ رکھنے والوں کے بیٹوں، بھائیوں اور رشتہ داروں کو ملازمت دے رہی ہے۔ اس طرح وہ اعلیٰ حکام کو خوش کر کے اپنے بیجا مطالبات پوشیدہ خواہشات کو پورا کرتی ہے۔ اور ملک و قوم دشمن سرگرمیوں پر پردہ ڈالتی ہے۔ اعلیٰ سرکاری افسروں کے رشتہ داروں کے چند نام پیش خدمت ہیں جو برما گروپ آف کمپنیز میں ملازم ہیں۔

۱۔ سابق صدر یحییٰ خان کے صاحبزادے آغا علی یحییٰ خان ریذیڈنٹ منیجر راولپنڈی کے دفتر سے منسلک ہیں۔

۲۔ ریٹائرڈ میجر جنرل ایم اے لطیف خان، ریذیڈنٹ منیجر راولپنڈی۔

۳۔ یحییٰ خان کے رشتہ دار مسٹر علی حسن خان ریذیڈنٹ منیجر راولپنڈی کے اسسٹنٹ ہیں۔

۴۔ سابق وزیر مالیات مسٹر شعیب کے صاحبزادے اقبال شعیب پاکستان پٹرولیم کراچی کے جنرل منیجر۔

۵۔ وزارت صنعت کے سابق سیکرٹری مسٹر ایس ایم یوسف کے بھانجے مسٹر خورشید احمد۔ یہ پلاننگ کمیشن کے سابق ڈپٹی چیئرمین کے داماد بھی ہوتے ہیں۔ سوئی گیس ٹرانسمیشن کراچی کے جنرل منیجر ہیں۔

ں کمپنی میں

ں، رشتہ داروں

کی بھرتی

وہ دوسروں کے جُوتے چمکاتے ہیں، مگر

اُن کے اپنے جُوتے بھدّے اور ٹُوٹے ہوتے ہیں

احتشام زرّیں فاروقی

"بُوٹ پالش"! یہ دو الفاظ "بوٹ" اور "پالش" جب ایک ساتھ آتے ہیں تو ہنسی آتی ہے۔ شاید اس لئے کہ ہمارے یہاں کی یہ بھی ایک روایت رہی ہے کہ اکثر لوگ کچھ لوگوں کو خوش کرنے کے لئے اُن کی اندھا دھند تعریفیں کرتے ہیں اور ان کی شان میں زمین اور آسمان ایک کر دیتے ہیں، تو پھر اس پر دوسرے لوگ کہتے ہیں کہ "بھائی بوٹ پالش نہ کرو"! خیر یہ بات تو ایک مزاح کا پہلو رکھتی ہے لیکن جو اصل بوٹ پالش ہے، وہ ایک درد لئے ہوئے ہے۔ کیا ہم نے کبھی ان کے بارے میں بھی سوچا ہے وہ سڑکوں کے کنارے فٹ پاتھوں پر صبح سے شام تک بیٹھے لوگوں کے جوتے صاف کرتے ہیں۔ یہ لوگوں کے جوتے سو سو بار اپنے ہاتھوں میں لیتے ہیں، اِن کو چمکاتے ہیں۔

کیا ہم کبھی ان پر بھی دھیان دیتے ہیں، جو لکڑی کا بکس اٹھائے سارا سارا دن شہر کے گلی کوچوں میں گھوما کرتے ہیں؟ یہ دوسروں کے جوتے چمکاتے ہیں۔ ان کی مرمت کرتے ہیں، مگر خود اُن کے جوتے بھدّے اور ٹوٹے ہوئے ہوتے ہیں۔ چمڑے کی چمک بھی ختم ہو چکی ہوتی ہے۔ سردی کا موسم ہو یا گرمیوں کی چلچلاتی دوپہر "بوٹ پالش"، "بُوٹ مرمت" کی آوازیں اکثر سنائی دیتی ہیں۔ اگر کسی کو بوٹوں پر پالش یا مرمت کرانی ہوتی ہے تو یہ کہتے ہوئے اٹھتا ہے۔ "کمبخت آرام کے وقت آجاتے ہیں"۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ موچی کسی کام کے چار آنے مانگتا ہے لوگ اس کے دو آنے لگاتے ہیں۔

لیکن کیا ہمیں کبھی ان کا بھی خیال آیا جو جوتے بناتے ہیں اور چمڑے کی بُو ہر وقت اپنے دماغوں میں بساتے ہیں۔؟ آج ہم آپ کا تعارف ایک موچی سے کرا رہے ہیں۔ موسیٰ شہر کراچی کی گلیوں اور سڑکوں پر گھومتا ہے۔ وہ اسی شہر میں پھیری لگاتا ہے۔ جہاں سونے چاندی کا کاروبار کرنے والے رہتے ہیں، جہاں زر اور زمین کے بیوپار ہوتے ہیں۔ جہاں ملوں کے مالک رہتے ہیں اور جہاں قیمتی جوتوں کے سوداگر اور خریدار رہتے ہیں۔ آپ ایسی ہی جوتوں کی بڑی بڑی شاندار دوکانوں میں چلے جائیں تو شیشوں اور جوتوں کی چمک دمک آپ کی آنکھوں میں چکا چوند پیدا کر دے گی۔ یہاں آپ کو ۹۹ روپے ۹۹ پیسے تک کا جوتا بنا رکھا ملے گا۔ اسکی قیمت کے برابر عام غریب آدمی کی آمدنی بھی مشکل سے ہوتی ہے۔ جبکہ اونچے لوگوں کے لئے یہ کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ ایسی پرنفیس مزاج حضرات اور معطر بیگمات شیشے کے دروازے روانی کے ساتھ کھول کر دوکان میں داخل ہوتے ہیں اور جوتا پسند کرتے ہوئے lovely, OK اور سویٹ جیسے الفاظ استعمال کرتے ہیں اور مسکراتے ہوئے دوکان کی تعریف کرتے ہوئے جوتا خرید کر باہر چلے جاتے ہیں۔ کیا انہیں اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ جوتے کے اصل بنانے والے کون ہیں؟

ان کی آمدنی

ایک نئے

جُوتے کے برابر

بھی نہیں ہوتی

سوٹ اور ٹائی پہننے والا، خوب صورت کاؤنٹر پر بیٹھا ہوا منیجر یا مالک؟ انگریزی کے ٹوٹے پھوٹے جملے بولنے والے سیلز مین؟ یا کوئی اور؟ جی ہاں، کوئی اور۔ وہ جن کا تصور کبھی خریدار نہیں کرتا

صاحب لوگ تیار ہوتے وقت چمکتا ہوا جوتا دیکھ کر بہت خوش ہوتے ہیں اس لئے کہ اُسے پہن کر اُن کی شخصیت ابھرتی ہے۔ لیکن انہیں اس بات کا خیال کب ہوتا ہے کہ ان کے جوتے پر کسی میلے کچیلے غریب نے پالش کی ہے۔ اِن لوگوں میں موسیٰ بھی ہے۔ وہ مچھ کا رہنے والا ایک موچی ہے۔ آپ میں سے کچھ لوگوں کے لئے مچھ کا نام شاید اجنبی ہو ویسے یہ مقام اپنے جیلخانے کی وجہ سے خاصا مشہور رہے۔ سنگین قسم کے جرم کرنیوالے یہاں لائے جاتے ہیں۔ چاہے انہوں نے ڈاکے ڈالے ہوں یا ڈاکہ پٹنے پر چیخ و پکار مچائی ہو۔ اس جیل میں سیاسی قیدیوں کے ساتھ وہ سب کچھ ہوتا ہے جو اور جیلوں میں نہیں ہوتا۔ ہاں تو ہم موسےٰ کے بارے میں بتا رہے تھے۔ وہ اب سے پانچ سال پہلے مچھ سے کراچی آیا تھا۔ پانچ سو تینتالیس میل کا لمبا سفر طے کر کے وہ یہاں روزگار کی تلاش میں پہنچا۔ کسی نے اُس سے کہا تھا کراچی بڑا شہر ہے۔ وہاں روزگار ملتا ہے لوگ عیش کرتے ہیں۔ لہٰذا موسیٰ بھی اتنی دور سے روٹی کمانے کے لئے یہاں آیا تھا۔ مگر مفلسی نے اُن کا ساتھ نہ چھوڑا۔ وہ کراچی میں بھی موچی کا موچی ہی رہا۔ اب وہ اِدھر اُدھر مارا پھرتا ہے تب بھی دو روپے پورے نہیں بن پاتے۔ اِس کا باپ بھی پہلے یہی کام کرتا تھا۔

موسیٰ جب دس گیارہ برس کا تھا تو اس کا باپ اندھا ہو گیا تھا۔ اُس وقت سے اُس نے یہ کام شروع کر دیا تھا۔ لیکن موسیٰ کو کم پیسے ملتے تھے اور جس کے پاس وہ کام کرتا تھا اکثر اُسے مارتا بھی تھا۔ پھر بھی موسیٰ بہت دنوں تک اُس کے پاس کام کرتا رہا اور جب کام چھوڑ دیا تو بھوکا مرنے لگا۔ پھر روزی حاصل کرنے کے لئے کراچی آگیا۔ ہمارے معاشرے میں روزگار کی کوئی ضمانت نہیں ہے۔ مُفلس ہمیشہ مفلس ہی رہتا ہے۔

نکولائی شیخونوف

سیب کا درخت

ترجمہ: عبدالمجیب خان

پناہ گاہ

میں بجلی جا چکی تھی۔ بجلی گُل ہو جاتے ہی پناہ گاہ میں کھسر پھسر شروع ہوگئی۔ کرسیوں اور بنچوں کے کھڑکھڑانے کی آوازیں آنے لگیں اور پھر ایک آواز بلند ہوئی۔ "دوستو! اپنی نشستوں پر اطمینان و سکون سے تشریف رکھئے۔" پھر وہ سب تاریکی میں اپنی نشستوں پر بیٹھ گئے۔ حملہ کئی گھنٹوں تک جاری رہا۔ مصوّر ایک لمبے سٹول پر بیٹھا تھا۔ جو اُس نے خود اس مقصد کے لئے بنایا تھا۔ وہ ہر وقت اُسے اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ مصوّر ایک چھوٹے سے قصبہ میں ایک منزلہ مکان میں رہتا تھا۔ اِس کے بہت سے ساتھی ابھی تک باہر گلیوں میں کھڑے تھے۔

اِس کے چھوٹے سے گھر میں ایک باغ تھا اور اس باغ میں پرانے زمانے کا فوارہ لگا ہوا تھا اور اب اس کے آس پاس سخت سردی کی وجہ سے پانی جم چکا تھا۔ وہ اپنے گھر کے باغ اور فوارے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اِس کے دماغ میں پڑوسیوں کی بہت سی آوازیں گونج رہی تھیں۔ زمانے کے خوفناک انقلابات، بچوں کے رونے کی آوازیں۔ سر سے پاؤں تک وہ ایک سیاہ غلاف میں لپٹا ہوا تھا۔

"میں قسم کھا کے کہتا ہوں کہ کچھ عرصہ کے لئے لینن گراڈ چلا جاؤں گا۔" ایک آواز سکوت کو توڑتی بلند ہوئی۔

"ہاں" مصوّر نے اپنے آپ سے کہا۔ "کیسا بیوقوف بناتا ہے مجھے، کوئی بھی یہاں سے اتنی دور نہیں جا سکتا۔ صرف چیخنے اور چلانے کے سوا کچھ نہیں۔ وہ تو پوسٹروں کے نام و نشان مٹا چکے، حالانکہ پوسٹروں سے تو مقبولیت ہوتی ہے۔ انہوں نے تو گلیوں اور کلبوں میں سے تمام پوسٹر غائب کر دیے، اور ان پوسٹروں کو نہ جانے کہاں دفن کر دیا ——— یہ سچ تھا، لیکن یہ ضروری بھی نہیں تھا کہ وہ اُن کے لئے لینن گراڈ میں کچھ کرتا اگر وہ کچھ کرتا بھی تو حالات اِس کے کام کو ناممکن بناتے۔ اِس کا اسٹوڈیو انتہائی ٹھنڈا تھا۔ اس کی ٹھٹھری ہوئی انگلیوں میں پنسل کا تھمنا مشکل ہو جاتا۔ اسٹو کی گرمی اس برف باری میں ناکافی تھی اور کسی بھی طرح اس کو گرمی محسوس نہیں ہوتی۔ قدرتی طور پر اس چھوٹے سے گھر میں کوئی پناہ گاہ بھی نہیں تھی۔ خطرے کے وقت اُسے پناہ لینے کے لئے آس پاس کی عمارتوں کی طرف بھاگنا پڑتا اور کئی کئی گھنٹے اُسے تہہ خانے میں بیٹھنا پڑتا۔

سردی کی شدّت سے وہ تھر تھر کانپتا اور اس کی ناک بہہ رہی ہوتی۔ کئی کئی دن کی بھوک میں وہ نیم مردہ ہو جاتا بھوک کی شدّت سے اس کے ہاتھ بھنچے ہوتے۔ اس کے لئے اپنے گھر سے آرٹسٹ کلب تک جانا مشکل ہو جاتا۔ گلیوں میں خاموشی چھائی ہوتی۔ کاروں کی دوڑ بند ہو چکی تھی۔ اور اب سارا علاقہ مکمل تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ تب اُس نے فوراً کہا کہ "وہ دانگا کو عبور کر سکتا ہے۔ اور پھر وہ ایک خوب صورت شہر میں داخل ہو سکے گا۔ جہاں اُسے کمرہ گرم ملے گا۔ اور کھانے کو بھی خوب ملے گا اور پھر اس کی افلاس و تنگ دستی میں گزرنے والی زندگی وقت کے ساتھ بدل جائے گی۔" ہاں" کیسا بیوقوف ہے تاریکی میں بیٹھا خیالی پلاؤ پکا رہا ہے ——— سردی اور بھوک، انتظار کرو بم تمہارے سروں پر گرنے والا ہے۔

زمانے کے انقلاب بڑے بڑے گھرانوں کو بلندی سے پستی کی طرف لے آتے ہیں۔ ہر شخص خاموش تماشائی بنا آنے والے لمحات کا انتظار کر رہا تھا۔ اور پھر کئی گھنٹوں کے بعد خطرے کے ٹل جانے کا اعلان ہوا۔ تب خوشی کی لہر اداس چہروں پر دوڑ گئی۔ خاموشی ختم ہوئی اور پھر چہ میگوئیاں شروع ہوگئیں۔ مصوّر کا بہت سا وقت ضائع ہو گیا تھا۔ وہ شام کو اِس پناہ گاہ میں آیا تھا۔ اور اب اسے کافی دیر ہو چکی تھی۔ خطرہ ٹل چکا تھا۔

وہ اپنے شہر سے کتنی محبت کرتا تھا ——— ہائے میرا شہر ——— بمباری سے تباہ ہو جائے گا۔ میرا شہر! اس کی سوچ میں درد و کرب پایا جاتا تھا۔ اِس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے۔ وہ کس قدر اداس اور غمزدہ تھا۔ اپنے شہر کی تباہی پر۔ جلد ہی خطرہ ٹل جانے کا مکمل طور پر سائرن بجا۔ پھر ہر طرف سے سائرن کی آوازیں آنے لگیں۔ وہ گلی سے باہر نکلا۔ کچھ نئے تباہ شدہ مکانوں کا ملبہ، بھڑکتی ہوئی آگ۔ انسانی آوازوں کی چیخیں ——— "اوہ اِس طرف آگ لگ گئی ہے۔ دھواں اور شعلے کس قدر بلند ہو رہے ہیں۔ ایک بچہ کارنر پر حیران پریشان کھڑا ہے۔ آرٹسٹ بچہ کی تصویر بناتے بناتے تھک جاتا ہے۔ بچہ کی کھلی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہیں، شاید وہ سوچ چکا تھا۔ اور اب تاریکی میں خوف سے چلا رہا تھا۔ پھر وہ ایک پناہ گاہ کی تصویر پینٹ کرنے لگا۔ بالکل اِسی کی طرح جو کہتا تھا: "شمعیں روشن کرو"! بھڑکتے ہوئے شعلوں کی تاب اس کے چہرے کو جھلسائے دے رہی تھی۔ سیاہ اداس دیواریں، ایک بوڑھی عورت گرم کوٹ میں لپٹی جل رہی تھی۔ لوگ کارنر پر حیرت زدہ کھڑے ہوئے تھے۔ ایک ننھا بچہ اپنی نوجوان ماں کی چھاتی سے چمٹا ہوا تھا۔

روشنی کی مدھم کرنیں سیڑھیوں پر پڑ رہی تھیں، دروازہ کھلنے سے سائرن کی آوازیں اندر آ رہی تھیں۔ خطرہ ٹل چکا تھا۔ مصوّر پناہ گاہ سے باہر نکلنے میں جلد بازی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ آخر دم تک تاریکی کے ختم ہونے کا انتظار کرتا تھا۔ ہجوم دھکم پیل کرتا تنگ راستوں سے باہر نکل رہا تھا۔ ہر کوئی پہلے نکلنے کی کوشش میں تھا۔ لوگوں کے چھوٹے بڑے گروہ ٹھنڈی دیواروں کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ جونہی وہ باہر گلی میں قدم رکھے گا اس کی آنکھیں عظیم تباہی دیکھیں گی۔ اِس بات سے وہ سخت خوف زدہ تھا۔ وہ سوچتا کہ کیسے اپنے راستے پر چل سکوں گا۔ اپنے چھوٹے سے گھر کی طرف جو صرف چند گز کے فاصلہ پر تھا۔ جیسے ہی وہ گلی سے باہر نکلا وہ حیرت سے رک گیا۔ اور اس کی غلط فہمی، غلط فہمی ہی رہی۔ ہر چیز اپنی جگہ بالکل درست تھی، چاندنی ہر سو بکھری ہوئی تھی۔ ہر چیز آسمان سے لے کر زمین تک چاندنی میں نہائی ہوئی تھی۔ نیلے آسمان پر ستارے جھلمل کر رہے تھے۔ چھوٹے چھوٹے سفید بادلوں کے ٹکڑے نیلے آسمان پر تیر رہے تھے۔ عالیشان عمارتیں زمین کے ایک وسیع علاقہ کو بلاوجہ گھیرے کھڑی تھیں۔ برف کے نرم نرم گالوں پر اس کے پاؤں دھنس رہے تھے۔ آسمان کا نیلا عکس برف کے تودوں پر پڑ رہا تھا۔ جس سے پوری سطح نیلی مخملی نظر آ رہی تھی۔

وہ لمبے لمبے قدم اٹھاتا اپنے گھر کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اِس سے اپنے گھر کو پہچاننے میں مشکل پیش آسکتی ہے۔ اُس نے اپنے آپ کو باغ میں پایا۔ اِس کا خواب حیرت انگیز تھا۔ باغ کے درخت برف سے ڈھکے ہوئے تھے۔ بلند درختوں کی چوٹیوں پر چاندنی پھوٹ رہی تھی۔ جہاں برف نے ڈالیوں کو ڈھانپ رکھا تھا۔ باغ کے تمام پھول خوش نما لباس زیب تن کئے، خوشی سے جھوم رہے تھے جیسے ہی مصوّران کے درمیان پہنچے گا، وہ اسے گھیرے میں لے لیں گے۔ اِس کے ہاتھوں کو چوم لیں گے۔ ہیرے اور جواہرات اس کے چاروں طرف بکھرے ہوں گے۔

وہ باغ کے درمیان کھڑا تھا۔ باغ کیا تھا جنت کا ایک گوشہ تھا۔ جہاں ہر طرف ہیرے و جواہرات بکھرے ہوئے تھے۔

ہر درخت سے خوب صورتی ابل رہی تھی۔ ہر پھول سے مہک پھوٹ رہی تھی۔ ہر چیز ایک دوسرے پر بازی لئے ہوئے تھی۔ ستارے ہیرے نچھاور کر رہے تھے۔ ہر چیز کے پیچھے انسان کی طاقت اور ہنرمندی پوشیدہ تھی۔ کتنا عظیم ہے یہ انسان !

برف سے ڈھکے ہوئے درخت چاند کی روشنی میں جل رہے تھے۔ جن سے سفید دودھیا آگ ابل رہی تھی۔ جن کا عکس ہر سو بکھری ہوئی برف پر پڑ رہا تھا۔ مصوّر حیرت سے کھڑا ہو گیا۔ حسین مناظر دیکھ کر اُس کی عقل نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔ وہ نہیں سمجھ سکا کہ جنت کے اس گوشے میں کیسے پہنچ گیا۔ اُسے کچھ علم نہیں تھا۔ اُس نے اپنے چاروں طرف نظر ڈالی۔ لوگ گلیوں کی طرف جا رہے تھے۔ نوجوان لڑکیوں اور لڑکوں کے قہقہے اس کے کانوں میں گونج رہے تھے۔ اُس نے اپنی فرکی ٹوپی کو اٹھایا اور چند لمحوں کے لئے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ جیسے ہی اُس نے آنکھیں کھولیں۔ اُس نے اپنے آپ کو زمین پر کھڑا پایا۔ یہ اس کا اپنا باغ تھا۔ وہ سیدھا برف سے ڈھکے ہوئے فوارے کی طرف گیا۔ اُس نے اپنے باغ کی فصیل کو کیسے عبور کیا ؟ وہ تو غائب ہو چکی تھی۔ ؟ ہوا کا ایک جھونکا اُسے بہت دور گلیوں کے اس پار پھینک آیا تھا۔ جہاں بہت سی ٹوٹی ہوئی کشتیوں کے ڈھانچے پڑے تھے۔

پورے باغ میں پرانے سیب کے درخت سے اب بھی خوب صورتی کی کرنیں پھوٹ رہی تھیں۔ وہ ہمیشہ سے فوارے کے قریب ہی کھڑا تھا۔ اُس نے چاروں طرف، شہر پر بکھری ہوئی چاندنی پر نظر ڈالی۔ کتنا حسین منظر ہے۔ جیسے پورے شہر کی رنگینی اس کے گرد ناچ رہی ہو۔ مصوّر کو یوں محسوس ہوا جیسے اُس نے پہلی مرتبہ اس دنیا میں قدم رکھا ہے۔ جبھی شہر کی رنگینی اس کا استقبال کر رہی تھی۔ پناہ گاہ میں اس کے خیالات کی جو فلم بن رہی تھی اب وہ ختم ہو چکی تھی۔ خوب صورتی، بہادری و شجاعت، محنت ان کا کیا مطلب ہے ؟ یہ الفاظ بڑے حیرت انگیز ہیں لیکن مطلب ؟ کیا وہ انہیں چھوڑ سکتا ہے ؟ نہیں ——— کبھی نہیں۔

شہر کی یہ خوب صورتی اور رنگینی آخر دم تک قائم رہے گی۔ یہ خوب صورتی اس وقت تک قائم رہے گی جب تک اس کے شہریوں میں خون کا آخری قطرہ تک موجود رہے گا۔ دشمن کو ہر صورت میں اپنی سرحدوں میں رہنا پڑے گا۔ اُسے جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دیا جائے گا۔ فوراً ہی، اُسے ہر لحاظ سے اُسے چھوڑنا پڑے گا۔

مصوّر کھڑا ہو گیا اور اُس نے اپنا کام شروع کر دیا۔ اُس کی خوشی و مسرت کی کوئی انتہا نہیں تھی۔ اس کا سر فخر سے بلند ہو گیا ———

کِشور ناہید

جلاوطنی

آج سرحد پہ خاموش توپوں کے ہونٹوں پہ
پپڑی کی تہہ بھی چیخ کر گِری ہے
ہر اک روز صبح سویرے سے، تاریکیوں کی تہوں تک
اکیلا ہی چلتا ہے سُورج
اداسی سے ہر آنکھ کو اپنی جانب، توجہ کی خاطر بلاتا ہے
لیکن
نگاہیں ملانے کا ہر حوصلہ
ہر بدن میں
فقط سِسکیوں کی طرح جاگتا ہے
اب فقط آبرو کا دھواں کُہر بن کے رُکا ہے
بس اب بُلبلوں کے ترنّم میں بھی
نوحہ زندگی کے سِتم خیز طوفان ہیں
اب فقط میرے اپنے چہیتوں کی لاشوں کے انبار ہیں
اب تو خر بھی یہاں ہنہناتے نہیں
جنگ بندی نہیں، سرحدیں بھی نہیں
اے مری مجھ سے روٹھی ہُوئی
میرے پدما کی اے زندہ تر سرزمیں
میری آنکھوں، تیرے آسمانوں
تری اور مری سرحدوں کے وہ سب فاصلے
جو مگر قربتوں کے سِوا کچھ نہ تھے
آج کیوں آنکھ میں اشک بن کے رُکے ہیں
بھلا کیوں مجھے
تیری قربت کے سایوں کو دھندلاہٹوں میں
بدلتے ہُوتے دیکھنے کے لیے زندہ رہنا پڑا

بدعنوانیاں

P.W.R.
پاکستان ویسٹرن ریلوے

رعایتی ٹکٹ
ماڈل کالونی
کراچی شہر
۰.۲۵

ان ٹکٹوں پر تاریخ کی مہر نہیں لگائی گئی

ریلوے میں استعمال شدہ ٹکٹ فروخت ہوتے ہیں

وھاب صدیقی

۲۸ جنوری ۱۹۷۲ء کا دن تھا۔ ماڈل کالونی اسٹیشن کے ٹکٹ گھر کے سامنے مسافروں کی لمبی قطار لگی ہوئی تھی۔ دو بجے والی لوکل سگنل کراس کر کے اسٹیشن کی طرف بڑھ رہی تھی۔ چند لمحوں بعد پلیٹ فارم پر پہنچنے والی تھی، لیکن ٹکٹ گھر کی کھڑکی ابھی تک بند تھی۔ کمرے میں چائے کے دور چل رہے تھے۔ ٹکٹ گھر پر آویزاں بورڈ "ٹکٹ گھر چوبیس گھنٹے کھلا رہتا ہے۔" مسافروں کا منہ چڑا رہا تھا۔ جب ٹرین اسٹیشن پر پہنچ گئی، تب ٹکٹ گھر کی کھڑکی کھلی۔ مسافر جلدی جلدی ٹکٹ لے کر پلیٹ فارم کی طرف بھاگنے لگے۔

مسافروں کی اس لمبی قطار میں محمد احمد بھی کھڑا تھا۔ اُس نے پانچ روپے کا ایک نوٹ دیا اور کراچی شہر کے تین ٹکٹ مانگے۔ بکنگ کلرک نے تین ٹکٹ، اور ۲۵ پیسے اُس کے ہاتھ میں تھما دیے اور دوسرے مسافر کو ٹکٹ دینے لگا۔ محمد احمد کو کھڑکی ہی کے پاس کھڑا دیکھ کر کلرک نے ڈانٹ کر کہا۔ "اب کیوں کھڑے ہو۔ یہاں سے جاؤ خواہ مخواہ رش کر رہے ہو۔"

"بابو جی! میں نے پانچ کا نوٹ دیا تھا۔ آپ نے ۲۵ پیسے واپس دیے۔ چار روپے اور دیں۔" محمد احمد نے التجا کی۔

"تم نے ایک روپیہ دیا تھا۔ ۲۵ پیسے تمہیں واپس کر دیے۔ تمہارا حساب برابر ہو گیا ہے۔" بکنگ کلرک نے کہا۔

"نہیں صاحب میں نے ۵ روپے دیے تھے۔ ذرا آپ اپنا حساب دیکھیں۔ بابو جی میں بہت غریب آدمی ہوں۔" محمد احمد نے کہا۔ جب اس کا اصرار زیادہ بڑھا تو "بابو صاحب" نے حکم دیا کہ "گیارہ بجے رات تک انتظار کرو۔ گیارہ بجے ہم حساب کریں گے۔ اگر چار روپے فاضل نکلے، تو تمہیں دے دیے جائیں گے۔"

محمد احمد کو عید ملنے اپنے رشتہ داروں کے ہاں جانا تھا۔ اگر وہ نہ جاتا۔ تو تعلقات ناخوشگوار ہونے کا اندیشہ تھا۔ وہ چار روپے کی خاطر نہ تو رشتے داروں کا گلہ مول لے سکتا تھا اور نہ ہی گیارہ بجے رات تک انتظار کر سکتا تھا۔ اگر اُسے یقین ہوتا کہ اُس کے روپے مل جائیں گے، تو انتظار بھی کر لیتا۔ چنانچہ انتظار کرنے کی بجائے اُس نے سفر کرنا ہی مناسب سمجھا اور ٹرین میں سوار ہو گیا۔ ٹرین میں اُس نے بغور ٹکٹوں کو دیکھا تو یہ دیکھ کر اُس کی حیرانگی کی کوئی حد نہ رہی کہ ٹکٹوں پر تاریخ کی مہر بھی نہیں لگی ہوئی تھی۔ اُسے جو ٹکٹ دیے گئے تھے ان کے نمبر ۲۹۳۲۴۶، ۲۹۳۲۴۷، ۲۹۳۰۲۴۸ تھے۔

عوام کی دیرینہ شکایت ہے کہ اگرچہ ہر ٹکٹ گھر پر "ٹکٹ گھر چوبیس گھنٹے کھلا رہتا ہے" کا بورڈ لگا ہوتا ہے۔ لیکن ٹکٹ گھر اُس وقت کھلتا ہے جب گاڑی سگنل کراس کر چکی ہوتی ہے۔ مسافر عجلت میں ہوتے ہیں۔ انہیں گاڑی میں سوار ہونے کی فکر ہوتی ہے۔ افراتفری میں بکنگ کلرکوں کو گھپلا کرنے کا موقع مل جاتا ہے۔ چونی، اٹھنی مار لینا تو معمولی بات ہے۔ بعض اوقات زیادہ روپے بھی مار لیتے ہیں۔ بارسوخ ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ بڑے اسٹیشنوں کے بکنگ کلرک کو تقریباً بارہ تیرہ سو روپے کی اوپر کی آمدنی ہوتی ہے۔ اچھے اسٹیشن باقاعدہ فروخت ہوتے ہیں۔ بڑھ چڑھ کر بولی دی جاتی ہے۔

گھپلے کا دوسرا طریقہ یہ ہے کہ ایک ٹکٹ دو مرتبہ فروخت کیا جاتا ہے۔ ریلوے کی زبان میں اس طریقہ کار کو "ری سیل" کہا جاتا ہے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ ٹکٹ تاریخ ڈالے بغیر جاری کر دیا جاتا ہے۔ منزلِ مقصود پر پہنچ کر جب مسافر ٹکٹ کلکٹر کو ٹکٹ واپس کرتا ہے۔ تو ایسے ٹکٹ جن پر تاریخ کی مہر نہیں لگی ہوتی۔ وہ ٹکٹ کلکٹر اُسی اسٹیشن کو واپس کر دیتا ہے۔ جہاں سے ٹکٹ جاری ہوا تھا۔ پھر وہ ٹکٹ دوبارہ فروخت کر دیا جاتا ہے۔ اس گھپلے میں بکنگ کلرک سے لے کر ٹکٹ کلکٹر تک سبھی افراد شامل ہوتے ہیں۔ محمد احمد کو جو تین ٹکٹ دیے گئے۔ وہ پہلے فروخت ہو چکے تھے۔

ریلوے کے قریبی حلقوں نے انکشاف کیا ہے کہ ٹکٹوں کی "ری سیل" صرف لوکل گاڑیوں میں ہی نہیں ہوتی۔ بلکہ دوسری گاڑیوں میں بھی ٹکٹ "ری سیل" کیے جاتے ہیں۔ صبح کے وقت جو ریل کار میرپور خاص جاتی ہے اُس میں بھاری تعداد میں بغیر تاریخ کے ٹکٹ جاری کیے جاتے ہیں۔ جو اُسی دن واپس کراچی بھیج دیے جاتے ہیں۔ اور شام کو "مہران" کے مسافروں کو جاری کر دیے جاتے ہیں۔ اسی طرح حیدرآباد کے مسافروں کو فروخت شدہ ٹکٹ دیے جاتے ہیں۔

یہ بدعنوانی وسیع پیمانے پر ہو رہی ہے۔ اس میں بڑے بڑے حکام بھی شریک ہیں۔ انہیں باقاعدہ حصہ ملتا ہے۔

کاشت کاروں کی بیدخلی

لیاقت حکومت نے زمین الاٹ کی ـــــ اور ایوبی آمریت نے چھین لی

حکومت کے الاٹمنٹ آرڈر کا عکس

جنرلوں کی خوشنودی کے لئے کاشتکاروں کو بیدخل کیا گیا

الفتح رپورٹ

۱۹۵۸ء کا مارشل لاء نافذ ہوا۔ ساتھ ہی مارشل لاء کے تحت عوام کو لوٹنے اور ملک کو تباہ کرنے کا ایک طویل سلسلہ شروع ہوگیا۔ پاکستان کی تعمیر و ترقی میں عوام نے کیا قربانیاں پیش نہ کیں۔ مارشل لاء کا سہارا لے کر ایوب خان اپنی ننگی آمریت پر اتر آیا۔ عوام کی بیش بہا قربانیاں فراموش کر دی گئیں۔ اُن کی زندگی ایک عذاب بنا دی گئی۔ عوام نے ایوب خان اور فوجی جنتا سے جو توقعات قائم کی تھیں چند ہفتوں کے بعد ختم ہوگئیں عوام نے محسوس کر لیا کہ ۱۹۵۸ء کا مارشل لاء سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کے تحفظ کے لئے لگایا گیا۔ اس نام نہاد تبدیلی سے عوام کا کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ مزدور، ہاری اور کاشت کار پہلے کی طرح استحصالی نظام کی چکی میں پستے رہیں گے۔

صوبہ سندھ کے ضلع خیرپور موضع کرونڈی تحصیل فیض گنج پکہ میں ۲۲ خاندانوں کو آباد کیا گیا تھا۔ ان کی آبادکاری ۱۹۴۸ء میں ہوئی تھی۔ ان کا آبائی پیشہ زراعت و کاشت کاری تھا۔ تقسیم سے قبل یہ خاندان موضع کھڈانہ تحصیل مہندر گڑھ، ضلع نارنول ریاست پٹیالہ اور مشرقی پنجاب کے مختلف علاقوں میں آباد تھا۔ برصغیر کی تقسیم کے دوران اُن کے گھروں کو لوٹ لیا گیا۔ ان کے مکانوں کو آگ لگا دی گئی اور انہیں ان کی اراضی سے بیدخل کر دیا گیا۔ لاکھوں کروڑوں لٹے پٹے مہاجرین کی طرح کاشت کاروں کا یہ بے سروسامان قافلہ پاکستان پہنچا۔ ۱۹۴۸ء میں حکومت نے اس خاندان کو خیرپور کی ایک تحصیل فیض گنج پکہ میں آبادکاری کا حکم دیا۔ اور ہر خاندان کو ۱۲ ایکڑ زمین الاٹ کی گئی۔ ہاریوں اور کاشت کاروں کو کیا چاہیئے۔ چند ایکڑ زمین جس پر وہ ہل چلا کر فصل اگا سکے۔ لٹے پٹے کاشت کاروں کا رشتہ ایک بار پھر زمین سے استوار ہوگیا۔ زمین سے ان کا یہ رشتہ ازلی اور ابدی ہے۔ تا آنکہ کوئی ظالم اُن کے درمیان نہ آجائے۔

۱۹۵۸ء میں مارشل لاء لگا تو ایوب خان زمین اور کاشتکاروں کے درمیان ظلم کی دیوار بن کر کھڑا ہوگیا۔ زمین اور کسان کے اس مقدس رشتہ کو توڑ دیا گیا۔ کاشت کاروں کو ان کی زمینوں سے بے دخل کر دیا گیا۔ ایوب خان کو زمین کی ضرورت تھی۔ تاکہ وہ فوجی جنرلوں اور کرنلوں کو خوش کر سکے۔ سونا اگلنے والی زمین کو فوجی جنتا کے اعلیٰ افسروں میں تقسیم کرنے کا منصوبہ تیار کیا گیا۔ اسی منصوبے کے مطابق جہاں بے شمار کاشت کاروں کو ان کی زمین سے بے دخل کیا گیا۔ ان خاندانوں پر بھی ظلم کے پہاڑ توڑے گئے یہ زمین جب کاشت کاروں کو دی گئی تھی، تو وہ خشک اور بنجر تھی۔ سبزی کا نام و نشان نہ تھا۔ کاشت کاروں نے اپنی محنت اور بچی کھچی پونجی سے بنجر اور ویران زمین کو قابل کاشت بنا دیا۔ اس زمین سے وہ اپنے خاندان کی کفالت کرتے تھے۔ یہ زمین ان کی پونجی تھی۔ کل کائنات تھی۔ ایوب خان اور اسکے حواریوں نے دن دھاڑے اُن کی پونجی۔ اُن کی کائنات پر ڈاکہ ڈالا اور کاشت کاروں کو بے دخل کر دیا گیا۔

زمین سے محروم ہونے کے بعد ۲۲ خاندان دربدر کی خاک چھاننے لگے۔ حکومت سے اپیلیں کی گئیں۔ متبادل روزگار کی فراہمی کا مطالبہ کیا گیا۔ امید کے ہر دروازے کو کھٹکھٹایا گیا۔ مگر کوئی جواب نہ ملا۔ ایوب خان اور اُس کی حکومت کے کل پرزوں نے اپنے کانوں میں روئی ٹھونس لی تھی۔ اُس وقت سے لے کر آج تک یہ ۲۲ خاندان بے یار و مددگار مفلسی کے دن گزار رہے ہیں۔

اِس ضمن میں یہاں اس بات کی بھی وضاحت ضروری ہے کہ ۲۲ خاندانوں کو خیرپور میں باقاعدہ زمین الاٹ کی گئی تھی۔ جس کی نقل بھی شائع کی جا رہی ہے۔ ان کے پاس کاغذات اور رسیدیں بھی موجود ہیں۔ مگر ابھی تک ان حق داروں کا ان کا حق نہیں دیا گیا۔

اس استحصالی نظام کے شکار صرف یہ ۲۲ خاندان ہی نہیں بنے پورا ملک بنا ہے۔ اور اس میں بسنے والے عوام ظلم و تشدد کی سیاہ رات میں زندگی گزارنے پر مجبور کر دیے گئے ہیں۔ ممکن ہے، موجودہ حکومت اُن کے مسئلے کو حل کرنے میں ممد و معاون ثابت ہو۔ مگر ۲۲ خاندانوں کی آبادکاری سے یہ مسئلہ حل نہ ہوگا اور نہ ملک و قوم پر پھیلی ہوئی یہ سیاہ رات ختم ہوگی۔ استحصال کا مکمل خاتمہ اس وقت ہوگا۔ صبح نو اس وقت نمودار ہوگی اور حق داروں کا حق اس وقت ملے گا جب اس ملک کے سارے محنت کش عوام شانہ سے شانہ ملا کر اٹھ کھڑے ہوں گے۔ اور سرمایہ داروں، جاگیرداروں کا نظام ختم کر کے ملک میں عوامی جمہوریت قائم کریں گے۔

غلط قیادت کی وجہ سے ٹریڈ یونینیں سرمایہ داروں کا ہتھیار بن چکی ہیں

محنت کشوں کی سیاست

ٹریڈ یونین تحریک نے محنت کشوں کو معیشت پسندی کے جال میں اُلجھا دیا

ابو داؤد

ہم بیسویں صدی کی آخری تہائی میں سانس لے رہے ہیں۔ یہ دور دنیا بھر میں سامراج اور اُس کی آلہ کار رجعت پسند قوتوں کی شکست اور سوشلزم کی فتح کا دور ہے۔ بقول چیئرمین ماؤزے تنگ "مشرقی ہوا مغربی ہوا پر غلبہ حاصل کر رہی ہے۔"

ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ کے کروڑوں محنت کش اور محبِ وطن عوام عوامی جمہوری انقلاب اور قومی آزادی کی تحریکوں میں موج در موج حصہ لے کر سامراج یعنی بین الاقوامی سرمایہ داری اور اُس کے مقامی حلیفوں، جاگیردار طبقہ، اجارہ دار نوکر شاہی سرمایہ داروں، گماشتہ سرمایہ داروں اور رجعت پسند حکمرانوں کو خس و خاشاک کی طرح بہائے لئے جا رہے ہیں۔ رجعت پسندی کے تمام کاغذی شیر اس عظیم طوفان کے سامنے لرزہ براندام ہیں۔ سامراج کے اپنے گھر میں بھی مزدور طبقہ اپنے دشمن پر کاری ضربیں لگا رہا ہے اور اس طرح نہ صرف اپنی نجات بلکہ سامراجی استحصال کی شکار مظلوم قوموں کی آزادی کے دن کو بھی قریب لا رہا ہے۔ سامراجی ممالک کا محنت کش اپنے عظیم معلّم اینگلز کے اس قول کو اچھی طرح ذہن نشین کر چکا ہے کہ "جو قوم دوسری قوموں پر ظلم کرتی ہے وہ خود بھی آزاد نہیں ہو سکتی۔"

ہمارا ملک پاکستان بھی عظیم افرو ایشیا کا ایک حصہ ہے اور اس وقت انقلاب کے حیات آفرین سورج کی تخلیق کے درد سے دوچار ہے۔ انقلابی طاقتیں روز بروز مضبوط تر ہوتی جا رہی ہیں اور انقلاب دشمن اپنے انجام سے خوف زدہ ہو کر ظلم و تشدد میں اضافہ کرتے جا رہے ہیں۔ ایک ایسے دور میں جب ملک انقلابی صورتِ حال سے دوچار ہے۔ پاکستان کے مزدور طبقے کی انقلابی جدوجہد میں اس کے رفیقِ حرب کسانوں اور حلیف انقلابی دانشوروں اور تمام محبِ وطن طبقات، جماعتوں، گروہوں اور افراد کا یہ فرض ہے کہ اپنے گرد و پیش کے حالات کا نہایت سنجیدگی اور گہرائی سے جائزہ لیں۔ اپنی طاقت کا اندازہ لگائیں اور دشمن کی قوت پر بھی نظر رکھیں۔ سب سے پہلے اپنے دوستوں اور دشمنوں کے درمیان واضح طور پر تمیز کریں۔ حالات پر اچھی طرح غور و فکر اور بحث مباحثہ کر کے اپنی سیاسی حکمتِ عملی اور لائحہ عمل ترتیب دیں۔

یہ بڑی خوش آئند بات ہے کہ اس وقت محنت کشوں اور دانش وروں کی صفوں میں اِس مسئلہ پر بہت وسیع پیمانہ پر بحث و مباحثہ جاری ہے۔ مختلف خیالات اور تجاویز سامنے آ رہی ہیں۔ اخبارات اور جرائد میں مضامین بھی اس عظیم مباحثہ کا ایک حصہ ہیں۔ میرے خیال میں ایک تو اس بحث مباحثہ اور گفتگو کے دائرہ کار کو اور زیادہ پھیلانے یعنی عوام کی عظیم اکثریت کو شریک کرنے کی ضرورت ہے کیونکہ عوام اور صرف عوام ہی انقلاب لا سکتے ہیں دوم یہ کہ مختلف الخیال افراد اور گروہوں کو ایک دوسرے کی بات نہایت خندہ پیشانی اور سنجیدگی سے سن کر اور سوچ سمجھ کر رائے قائم کرنی چاہیئے۔ اپنے علاوہ سب کو "غلط- گمراہ، غدار وغیرہ قرار دینا انتہائی نامناسب طریقہ ہے۔ کیونکہ اس سے انقلابی قوتوں میں اتحاد اور قربت کی بجائے انتشار اور دوری پیدا ہوتی ہے۔ بحث و مباحثہ جاری رکھنے کے علاوہ انقلاب کے داعی افراد اور جماعتوں کا فرض ہے کہ اپنی راہ اور سیاسی لائحہ عمل کے مطابق عملی جدوجہد میں حصہ لیں۔ عمل اور صرف عمل ہی نظریہ کے صحیح یا غلط ہونے کی کسوٹی ہے۔ انقلاب کی بنیادی قوت یعنی محنت کش اور محبِ وطن عوام عملی جدوجہد کے تجربات سے گزر کر ہی کسی سیاسی راہ کو قبول کرتے ہیں۔

عوام جب ایک نظریہ کو سوچ سمجھ کر قبول کر لیں تو وہ نظریہ ایک زبردست مادی قوت میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ جس کے بغیر کوئی انقلاب کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اپنے دوستوں اور دشمنوں میں تمیز کرنے کے لئے کسی بھی ملک میں موجود بڑے بڑے اور اہم تضاد کا تعین کرنا لازمی ہے۔ افریقہ، ایشیا اور لاطینی امریکہ کے ممالک میں ایک واضح اور اہم ترین تضاد سامراج اور عوام کے درمیان ہے۔ اکثر ممالک میں سامراج براہ راست حکمرانی نہیں کرتا بلکہ ملک کے اندر اپنے حلیفوں کے ذریعہ لوٹ کھسوٹ کرتا ہے۔ چنانچہ سامراج کے خلاف جدوجہد کا مطلب ہے اندرونِ ملک سامراج کے حاشیہ بردار طبقات اور قوتوں کے خلاف لڑنا سامراج، جو کہ سرمایہ داری کی انتہائی شکل ہے۔ منڈیوں کی تلاش میں مختلف طریقے استعمال کرتا ہے۔ موجودہ دور میں اُس کے خاص ہتھکنڈے نام نہاد امداد یعنی سودی قرضے اور تجارتی ہیرا پھیری کے ذریعے معیشت پر قبضہ جمانا، اپنے نام نہاد ماہرین کو امداد لینے والے ممالک میں بھیج کر اندرونی معاملات میں مداخلت کرنا، معاشی معاہدوں میں پھانسنا ثقافتی، تعلیمی اور دیگر محاذوں پر تسلط قائم کرنا ہے اور فوجی معاہدوں میں جکڑنا وغیرہ ہیں۔ اِن تمام ذرائع سے سامراج اپنا اثر و نفوذ بڑھا کر ملک پر اپنے ایجنٹوں کی حکومت مسلط کر دیتا ہے اور حسبِ ضرورت حکمران ٹولوں میں ردّ و بدل کرتے رہتا ہے۔

اندرونِ ملک سامراج کے حلیف طبقات میں جاگیردار اور سامراجی امداد کی پیداوار گماشتہ سرمایہ دار اور نوکر شاہی سرمایہ دار سب سے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ جن کا تحفظ طفیلی حکمران ٹولہ اور ریاستی مشینری کے دیگر کل پرزے عوام پر جبر و تشدد کے ذریعے کرتے ہیں۔ اندرون ملک ایک اہم تضاد جاگیردار طبقے اور عوام کے درمیان تضاد ہے۔ جاگیردار طبقہ پس ماندہ ممالک میں ۸۰ فی صد عوام یعنی غریب و درمیانہ کسانوں اور کھیت مزدوروں کا براہ راست استحصال کرتا ہے۔ یہ استحصال محض اقتصادی ہی نہیں بلکہ سیاسی سطح پر بھی کیا جاتا ہے۔ شہروں میں مزدور طبقہ کچھ نہ کچھ سیاسی آزادیاں تو حاصل کر چکا ہے۔ لیکن دیہات میں غریب کسان، کھیت مزدور، دستکار بلکہ درمیانہ اور بعض اوقات امیر کسان بھی ہر قسم کے سیاسی حقوق سے محروم ہیں اور جاگیرداروں کے جبر و تسلّط کا شکار ہیں۔ اندرونِ ملک تضادات میں سے اکثر پس ماندہ ممالک میں جاگیردار طبقہ اور عوام کے درمیان تضاد

قومیتوں کا جبری اور مصنوعی اتحاد نفرت اور تعصب کو جنم دیتا ہے

سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ چنانچہ ان ممالک میں عوامی جمہوری انقلاب کا مطلب ہے زرعی انقلاب جس کی بنیادی قوت کسان طبقہ ہے۔ کیونکہ ملک کی اسی فی صد آبادی کی شرکت اور امداد کے بغیر کوئی انقلاب کامیابی کا منہ نہیں دیکھ سکتا۔

اندرون ملک دوسرا اہم تضاد اجارہ دار نوکر شاہی سرمایہ دار طبقہ گماشتہ سرمایہ دار طبقہ اور مزدور طبقے کے درمیان ہے۔ پاکستان میں سرمایہ داری کی ترقی چونکہ بہت بڑی حد تک سامراجی قرضوں کی مرہون منت ہے۔ اس لئے ان قرضوں کے نتیجہ میں پروان چڑھنے والا سرمایہ دار طبقہ بھی جاگیردار طبقہ کی طرح سامراج کا حلیف ہے۔ اس وجہ سے یہ طبقہ جاگیرداری سے تضاد رکھنے کے باوجود اس کے خاتمہ کے لئے کوئی قدم نہیں اٹھاتا۔ نہ ہی سامراج کے خلاف جدوجہد میں حصہ لیتا ہے۔ پاکستان کے حکمران طبقات، جاگیردار، اجارہ داری نوکر شاہی اور سرمایہ دار، گماشتہ سرمایہ دار طبقات ہیں۔ یہ طبقات اور اُن کے محافظ ریاستی ادارے عوامی جمہوری انقلاب کا نشانہ ہیں۔

اس کے علاوہ قومی تضاد بھی بڑی اہمیت کا حامل ہے دنیا میں اس وقت دو قسم کی ریاستیں پائی جاتی ہیں۔ قومی ریاستیں جن میں مشترکہ زبان، ثقافت اور تاریخی رشتے رکھنے والی صرف ایک قوم آباد ہے۔ ریاستوں کی دوسری قسم وہ ہے جن میں ایک سے زیادہ قومیں یا قومیتیں آباد ہیں۔ ایسی ریاستوں کو کثیر قومی ریاستیں کہا جاتا ہے۔ سوشلسٹ ممالک میں جہاں اقتدار مزدور طبقہ کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ پرولتاری بین الاقوامیت "کے اصول اور" دنیا کے مزدورو ایک ہو جاؤ" کے نعرہ کی روشنی میں تمام قومیں مکمل مساوات، بھائی چارہ اور رضاکارانہ اتحاد کی بنیاد پر صلح آشتی اور برادرانہ ماحول میں رہتی ہیں اور مارکسزم لینزم کی عظیم تعلیمات کی روشنی میں تمام قوموں کے حق خوداختیاری کو آئینی طور پر تسلیم کیا جاتا ہے۔ چنانچہ کسی قسم کے قومی جبر اور قومی جھگڑوں کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بڑی اور چھوٹی تمام قومیں مساوی حقوق رکھتی ہیں اور حق خوداختیاری یعنی حق علیحدگی کو آئینی طور پر تسلیم کئے جانے کے باعث رضاکارانہ اتحاد کے مضبوط رشتوں میں منسلک ہوتی ہیں چنانچہ زارشاہی روس جیسے "قومی کا زندان" کہا جاتا تھا۔ پرولتاری انقلاب کے بعد قومیتوں کے رضاکارانہ اتحاد اور بھائی چارہ کا گہوارہ بن گیا اور جب فن لینڈ کے عوام نے علیحدہ قومی ریاست کی تشکیل کا مطالبہ کیا تو عظیم لینن کی رہنمائی میں کمیونسٹ پارٹی نے بخوشی انہیں ان کا یہ جمہوری حق دے دیا۔

لیکن اس کے برعکس سرمایہ دار دنیا کی کثیر قومی ریاستوں میں عموماً ایک قوم دوسری قوموں پر غلبہ حاصل کر کے ان کا استحصال کرتی ہے اور غالب قوم کا حکمران طبقہ مختلف قومیتوں کو جبری اور مصنوعی اتحاد کی زنجیروں میں جکڑ کر قومی منافرت اور تعصب کو ہوا دیتا ہے اور مختلف قومیتوں کے محنت کشوں کو آپس میں لڑاتا ہے۔ ایسے ممالک میں حکمران قوم کے عوام تو صرف اپنی قوم کے جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کے استحصال کا شکار ہوتے ہیں۔ لیکن محکوم اور مظلوم قومیتوں کے عوام قومی جبر یعنی ریاستی ڈھانچہ اور ذرائع پیداوار پر قابض قوم کے استحصالی طبقات کی لوٹ کھسوٹ سے بھی دوچار ہوتے ہیں۔ چنانچہ قومی تضاد بھی ایک اہم تضاد کا درجہ اختیار کر لیتا ہے۔ جسے تمام قوموں کے حق خوداختیاری کو تسلیم کئے جانے کے مارکسی لینی اصول کے علاوہ کسی اور طریقہ سے حل نہیں کیا جا سکتا۔ کثیر قومی سرمایہ دار ممالک میں حکمران قوم کا سرمایہ دار طبقہ پورے ملک کے عوام کا آزادانہ استحصال اور محکوم قوموں کا نوآبادیاتی استحصال جاری رکھنے کے لئے مختلف پُرفریب نظریات اور نعروں کو فروغ دیتا ہے۔ ان نظریات سے اختلاف کو ملک دشمنی، غداری اور دشمن کی ایجنٹی قرار دیتا ہے اور محنت کش عوام کو بھی جارحانہ قوم پرستی کے اُن پُرفریب اور گمراہ کن نعروں کے جال میں پھانسنے کے لئے مزدوروں کی صفوں میں موجود اپنے ایجنٹوں کے ذریعے گمراہ کن پروپیگنڈہ کرتا رہتا ہے دوسری طرف مظلوم قومیتوں کا ابھرتا ہوا سرمایہ دار طبقہ اپنی قوم کے محنت کشوں کا بلا شرکت غیرے استحصال کرنے کا حق حاصل کرنے کے لئے قومی نعروں کا سہارا لیتا ہے۔ اپنے طبقاتی مفادات کو پوری قوم کے مفادات سے تعبیر کرتا ہے۔ اور جارحانہ قوم پرستی کے جذبات ابھار کر حکمران قوم کے استحصالی طبقات کے ساتھ ساتھ اس قوم کے عوام کو بھی دشمن قرار دیتا ہے۔ اس طرح مختلف قومیتوں کے محنت کشوں کے اتحاد کو پارہ پارہ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن خود غالب قوم کے استحصالی طبقہ سے سودے بازی اور مفاہمت کا کوئی موقعہ ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔ ایسی کثیر قومی ریاست کے انقلابی کارکنوں اور محنت کشوں کا فرض ہے کہ وہ ہر قیمت پر پرولتاری بین الاقوامیت اور محنت کش طبقہ کا اتحاد برقرار رکھنے کے فریضہ کو اولیت دیں۔ اپنی طبقاتی تنظیم کو ملک گیر بنیاد پر قائم رکھیں یعنی تنظیمی اتحاد برقرار رکھیں۔ غالب قوم کے انقلابیوں کا فرض ہے کہ مظلوم قومیتوں کے حق خوداختیاری یعنی قومی آزادی کے حق کو تسلیم کریں اور اس سلسلہ میں عوام میں وسیع پیمانہ پر پروپیگنڈہ کے علاوہ عملی جدوجہد بھی کریں۔ کیونکہ مظلوم قومیتوں کے حق خوداختیاری کے نظریاتی یا عملی انکار یا اس سلسلہ میں جدوجہد سے پہلوتہی کا مطلب اپنی قوم کے استحصالی طبقات کے نوآبادیاتی عزائم اور استحصال میں مدد دینے کے علاوہ کچھ نہیں جو حکمران قوم کی جارحانہ قوم پرستی کا شکار ہو کر محنت کش طبقہ کے بین الاقوامی اتحاد کو نقصان پہنچاتا ہے جس کے نتیجہ میں حکمران قوم کے عوام بھی استحصال سے نجات حاصل نہیں کر سکتے کیونکہ "جو قوم دوسری قوموں کو دباتی اور لچکتی ہے وہ خود بھی آزاد نہیں ہو سکتی"۔ امریکہ کے انقلابی عوام، ویٹ نام، کمبوڈیا اور لاؤس کی قومی آزادی کی تحریکوں کی بھرپور حمایت کرتے ہیں۔ اسی طرح بھارت کے نکسل باڑی انقلابی ہندوستان کی تمام قومیتوں کے حق خوداختیاری کو تسلیم کرتے ہیں اور کشمیری عوام کی جدوجہد آزادی کی بھی حمایت کرتے ہیں۔

ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ کے ممالک میں ان تمام تضادات کو حل کرنے کا واحد ذریعہ عوامی جمہوری انقلاب یعنی زرعی انقلاب ہے۔ جس کی قیادت مزدور طبقہ کے ہاتھ میں ہو گی اور جس کی سب سے بڑی طاقت کسان طبقہ ہے۔ اس انقلاب کو برپا کرنے کے لئے سائینسی سوشلزم کے انقلابی نظریہ سے مسلح مزدور طبقہ کی اپنی جماعت کا وجود لازمی ہے ایک ایسی جماعت جو عوام میں پوری طرح رچی بسی ہو اور جس کے کارکن نظریاتی طور پر پختہ، بے لوث، بہادر اور عوام میں گھلے ملے ہوئے ہوں۔ ایسی انقلابی جماعت کی بنیاد پرولتاری طبقہ پر ہی رکھی جا سکتی ہے۔ ادنیٰ بورژوا طبقہ کے انقلابی دانشور اس جماعت کے قیام کے سلسلے میں اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔ لیکن صرف اس صورت میں کہ وہ اپنے آپ کو عملی طور پر پرولتاریہ کی سطح پر لے آئیں اور "عوام سے عوام تک" کے انقلابی اصول پر عمل پیرا ہوں یعنی عوام کے استاد بننے سے پہلے عوام کے سچے شاگرد بنیں۔

پرولتاریہ کی انقلابی جماعت یقینی طور پر ایک سیاسی جماعت ہی ہو سکتی ہے۔ مزدور یونین یا لیبر فیڈریشن سیاسی پارٹی کا کردار ادا نہیں کر سکتی کیونکہ سیاسی اقتدار پر قبضہ کرنے کی جدوجہد کی قیادت سیاسی پارٹی ہی کر سکتی ہے جبکہ مزدور یونین کا مقصد محض معاشی مطالبات کے لئے آواز اٹھانا ہوتا ہے۔ یہ ایک محدود دائرہ میں کولہو کے بیل کی طرح گردش کرتی رہتی ہے اور اس دائرہ سے باہر نہیں نکل سکتی۔

الفتح

انقلابی طالب علم مزدوروں اور کسانوں کو اپنا استاد اور رہنما تسلیم کرلیں

کیونکہ ٹریڈ یونین جس قانون کے تحت بنائی جاتی ہے اس کی پابندی اس کے لئے لازمی ہوتی ہے اور یہ قانون حکمران سرمایہ دار جاگیردار بناتا ہے جو کسی صورت میں اپنے مفادات کے خلاف کام کرنے والی کسی تنظیم کو کام کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ چنانچہ آخری تجزیہ میں ٹریڈ یونین اور ایسی تمام اقتصادی اور سیاسی تنظیمیں جو استحصالی طبقہ کے بنائے ہوئے قانون کی پابند ہوں۔ سرمایہ داری جاگیرداری کے تحفظ اور استحکام کا باعث بنتی ہے۔ موجودہ دور میں خصوصاً جب کہ مزدوروں کی ہر معاشی جدوجہد فوری طور پر ریاستی مشینری سے ٹکراؤ میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ ٹریڈ یونین کی خامیاں اور مجبوریاں اسے ایک ناکارہ چیز ثابت کرتی ہیں۔ چنانچہ اب ہمارے ملک میں مزدور یونین پرولتاریہ کے لئے ایک بیکار اور کند ہتھیار ثابت ہو چکی ہے بلکہ اب ٹریڈ یونین خود محنت کشوں کے خلاف سرمایہ دار طبقہ اپنی آلہ کار نوکر شاہی، پولیس اور اپنے دیگر پالتو کتوں کو مزدوروں پر چھوڑ دیتا ہے۔ امن اور قانون کے نام پر مزدوروں پر تشدد کر کے انہیں گرفتاریوں، لاٹھی چارج اور فائرنگ کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ ان اقدامات کا ٹریڈ یونین کے پاس کوئی جواب نہیں ہوتا۔ چنانچہ مزدور تنظیم ٹوٹ پھوٹ کر ختم ہو جاتی ہے۔ پچھلے چند سالوں میں پاکستان کے ننانوے فیصد ہڑتالوں کا یہی حشر ہوا ہے جو یونین ہڑتال اور جدوجہد سے گریز کر کے گفت و شنید اور سودے بازی کا طریقہ اختیار کرتی ہیں وہ بہت جلد پاکٹ یونینوں میں تبدیل ہو کر مزدور دشمن سرگرمیوں میں تبدیل ہو جاتی ہیں، اور ایسی تنظیموں کے عہدیدار اپنے ذاتی مفادات کے لئے سرمایہ داروں کے آلہ کار بن جاتے ہیں اور مزدور بجا طور پر انہیں اپنا دشمن سمجھتے ہیں۔ چاہے وہ کیسے ہی انقلابی اور سوشلسٹ نظریات کے دعویدار ہوں۔ اس سلسلہ میں چند مثالیں مددگار ثابت ہوں گی۔ لڑاکا اور جنگجو تنظیموں میں سے ویلیکا ٹیکسٹائل ملز اور داؤد کاٹن ملز کراچی۔ بکو اور پیکجز کوٹ لکھپت لاہور کی مزدور تنظیموں کے نام لئے جا سکتے ہیں جن کے رہنماؤں کو ملازمتوں سے نکال کر بے شمار مزدوروں کی چھانٹیاں کی گئیں اور سینکڑوں مزدوروں کو قید بامشقت اور کوڑوں کا نشانہ بنایا گیا۔ چنانچہ ان تنظیموں کو تشدد کے ذریعے کچل دیا گیا۔ دوسری طرف "صنعتی امن" اور "اصولی اتحاد" پر کاربند بائیں بازو کی لیڈرشپ کی بہترین مثال ایر ڈیفنیز ایمپلائز یونین پی آئی اے برانچ مغربی پاکستان ہے جو چوبیس سال تک بلاشرکت غیرے مزدوروں کی نمائندگی کرتی رہی لیکن دائیں بازو کی انتہائی رجعت پسند مزدور دشمن جماعت اسلامی کے کارندوں کے ایک ہی حملہ میں چاروں شانے چت نظر آئی۔ ستلج کاٹن ملز اوکاڑہ کے کامریڈ عبدالسلام کا بھی اسلام پسندوں کے ہاتھوں یہی حشر ہوا۔ آجکل تقریباً تمام ٹریڈ یونینیں جو بارگیننگ ایجنٹ بن کر یا اس کے بغیر مزدوروں کی نمائندگی کی دعویدار ہیں۔ دراصل پاکٹ یونینیں ہیں جن کا کام بیان بازی اور سودے بازی کے علاوہ کچھ نہیں لڑاکا یونینیں تشدد کا شکار ہو کر کچلی جا چکی ہیں۔

مزدوروں کو متحد اور ایک ہو جانے کا درس دینے والے رہنماؤں نے عملی طور پر انہیں بے شمار چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں بانٹ رکھا ہے جنہیں کسی بھی صورت میں یکجا نہیں کیا جا سکتا محنت کشوں کے بین الاقوامی نعرے "دنیا کے مزدورو ایک ہو جاؤ" کے ساتھ اس سے بڑا کوئی ظلم نہیں ہو سکتا جو ہمارے نام نہاد مزدور رہنماؤں نے کیا ہے چنانچہ مزدور اتحاد کو ٹریڈ یونین کے پلیٹ فارم سے ہرگز عملی جامہ نہیں پہنایا جا سکتا۔ کیونکہ اب ٹریڈ یونین مزدور طبقہ کی طبقاتی تنظیم کا کردار ادا کرنے کے قابل نہیں رہی ہے بے شک ایک طویل عرصہ تک مزدوروں کو متحد اور منظم ہو کر بورژوازی کے خلاف جدوجہد کرنے کا حوصلہ دینے اور طبقاتی شعور حاصل کرنے کے لیے ٹریڈ یونین نے قابل قدر کردار ادا کیا ہے جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن آجکل جبکہ پرولتاریہ نے بے شمار طبقاتی لڑائیوں سے تجربہ حاصل کر کے بے مثال سیاسی شعور سے مسلح ہو چکا ہے۔ اسے اپنی جدوجہد جاری رکھنے کے لیے کسی اور ہتھیار کی ضرورت ہے اور وہ ہتھیار بجا طور پر پرولتاریہ کی طبقاتی تنظیم کہلانے کا مستحق ہو گا ایک پرولتاری سیاسی پارٹی ہے جس کے انقلابی پرچم تلے جمع ہو کر مزدور طبقہ کسانوں اور دوسرے عوام دوست طبقات سے متحد ہو کر اپنے طبقاتی دشمنوں پر ضرب کاری لگا سکے۔ اس سلسلے میں ایک اور بات کی وضاحت ضروری ہے کہ بعض حضرات "بائیں بازو" کی موجودہ ٹریڈ یونین لیڈرشپ کو بجا طور پر مسترد کر کے ٹریڈ یونین ازم کے اصولوں پر کاربند "نئی اور ایماندار" قیادت پر زور دیتے ہیں اور اس طرح پرولتاریہ کی سیاسی پارٹی کی ضرورت سے انکار کرتے ہیں۔ یہ ایک غلط اور گمراہ کن نظریہ ہے۔ کیونکہ موجودہ صورت حال کی بنیادی وجہ یہ نہیں ہے کہ ٹریڈ یونین کی لیڈرشپ مفاد پرست اور مزدور دشمن افراد کے ہاتھوں میں ہے بلکہ موجودہ صورت حال اور غلط قیادت کا نتیجہ ہے۔ اس قیادت کا کہ ٹریڈ یونین بجائے خود پرولتاریہ کے بجائے بورژوازی کا ہتھیار بن چکا ہے جسے وہ طبقاتی مفاہمت اور صنعتی امن کے لیے استعمال کرتا ہے تاکہ وہ بہ اطمینان محنت کشوں کا استحصال جاری رکھ سکے۔ چند حضرات "مزدور قیادت" کا نعرہ لگا کر بورژوا پارٹیوں کی اصلاح یا ان پر قبضہ کی کوشش میں مصروف ہیں اور اس کوشش میں ناکامی کے بعد اپنی بورژوا قیادت کو مزدور قیادت کے نام پر کسی نئی سیاسی پارٹی کی شکل میں پیش کرنا چاہتے ہیں۔ ایسی تمام کوششوں اور پرولتاریہ کی اپنی پارٹی کی ضرورت سے انکار کا مقصد سوائے اس کے کچھ نہیں کہ محنت کش عوام کو سرمایہ داروں، جاگیرداروں اور ادنیٰ بورژوازی سیاسی پارٹیوں کا دم چھلہ بنا کر رکھا جائے ٹریڈ یونینوں کی طرح کسان کمیٹیاں اور طالب علم تنظیمیں بھی اس دور میں عوامی جمہوریت اور سوشلزم کی جدوجہد میں کوئی مثبت کردار ادا نہیں کر سکتیں۔ کسان کمیٹیاں جاگیرداری کے خاتمہ کے لیے غریب کسانوں اور کھیت مزدوروں کو پرولتاریہ کی اپنی قیادت میں متحد و منظم کرنے کی بجائے خوشحال کسانوں کے مسائل پر آواز بلند کرنے کے کام میں مصروف رہتی ہیں اور ان کی قیادت وکیلوں، زمینداروں، امیر کسانوں اور آڑھتیوں کے ہاتھوں میں ہے۔ ان کی تمام تر رکنیت میں بھی کھیت مزدور اور غریب کسان برائے نام ہی نظر آتے ہیں۔ کسان کمیٹیاں بڑے جاگیرداروں کے علاقوں میں بالکل ناپید ہیں۔ ان کا وجود صرف ایسے علاقوں تک محدود ہے جہاں بڑے یا چھوٹے مالک کسان موجود ہیں، مثلاً لائل پور، کیونکہ جاگیردار اپنے علاقہ میں ایسی کسی تنظیم کو برداشت ہی نہیں کرتا نہ ہی کوئی مزارعہ۔ غریب کسان یا کھیت مزدور کھلم کھلا ایسی تنظیموں کے جلسے جلوسوں میں شرکت کی جرأت کر سکتا ہے۔ طالب علم تنظیمیں صرف کالج انتخابات کے زمانہ میں زور پکڑتی ہیں اس کے بعد وہ برائے نام ہی رہ جاتی ہیں اور طلبا کے چھوٹے چھوٹے مسائل بھی حل نہیں کرا سکتیں موجودہ دور میں صرف اسی طالب علم کو انقلابی قرار دیا

باقی صفحہ ۳۰ پر ملاحظہ فرمائیں

نیشنل اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے صدر ڈاکٹر رشید حسن خاں کی پریس کانفرنس

کراچی

عوامی جمہوریت کے قیام کی جدوجہد جاری رہے گی

نمائندہ خصوصی

نیشنل اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے صدر اور انقلابی رہنما ڈاکٹر رشید حسن خان نے مطالبہ کیا ہے کہ جاگیرداروں، بڑے زمین داروں اور فوجی حکام سے بلا معاوضہ زمین چھین کر ہاریوں اور کاشت کاروں میں تقسیم کی جائیں اور ملک سے مارشل لاء فوری طور پر اُٹھایا جائے کیونکہ اس کو برقرار رکھنے کا کوئی جواز نہیں۔ ڈاکٹر رشید حسن خان ۳۱ جنوری کی سہ پہر ڈاؤ میڈیکل کالج کی کنٹین میں ایک پریس کانفرنس سے خطاب کر رہے تھے۔ کنٹین کا وسیع و عریض ہال طلبہ سے بھرا ہُوا تھا۔ ڈاکٹر رشید نے پریس کانفرنس میں نیشنل اسٹوڈنٹس فیڈریشن کا گیارہ نکاتی پروگرام پیش کیا اور ملک کی سیاسی صورتحال پر روشنی ڈالی۔

ڈاکٹر رشید حسن نے نے سیاسی صورتِ حال پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ ۱۹۵۸ء میں عوامی تحریک کو دبانے اور سرمایہ داروں کے مفادات کا تحفظ کرنے کے لئے مارشل لاء لگایا گیا۔ ایوب خان سامراج گماشتہ سرمایہ داروں اور اجارہ دار سرمایہ داروں کا نمائندہ تھا۔ اُس نے اگرچہ اپنی پہلی تقریر میں جمہوریت کی بحالی کا وعدہ کیا تھا لیکن مارشل لاء تین سال سے زیادہ عرصہ تک برقرار رہا۔ اِس زمانے میں مزدوروں، کسانوں، طلبہ اور عوام پر جبر و تشدد کیا گیا۔ ظُلم کے پہاڑ توڑے گئے۔ اور اجارہ دار سرمایہ داری کو فروغ دیا گیا۔ پھر ایوب نے اپنی آمریت کو چھپانے کے لئے "بنیادی جمہوریت" کا ڈرامہ رچایا۔ یہ نام نہاد بنیادی جمہوریت بھی آمریت ہی کی دوسری شکل تھی۔ ۱۹۶۸ء میں طلبہ اور عوام نے ایوبی آمریت کے خلاف تحریک شروع کی۔ وہ اس شب تار کو ختم کرنا چاہتے تھے۔ وہ پاکستان کو آزاد اور خوش حال دیکھنے کے تمنائی تھے۔ اِس موقع پر سرمایہ داروں، جاگیرداروں اور نوکر شاہی نے جنرل یحییٰ خان کو آگے بڑھایا۔ یحییٰ خان "طلبہ اور مزدوروں" کا نعرہ لگاتے ہوئے فوج کی مدد سے برسر اقتدار آیا۔ اس نے اپنے اقتدار کو مستحکم کرنے کے لئے "جمہوریت کی بحالی" کا وعدہ بھی کیا۔ تعلیمی پالیسی اور لیبر پالیسی کا اعلان بھی کیا۔ لیکن ان تمام نام نہاد اقدامات کا مقصد عوامی تحریک کو روکنا اور استحصالی نظام کو برقرار رکھنا تھا۔ یحییٰ خان بھی اجارہ دار سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کا نمائندہ تھا۔ اُس نے بھی طلبہ، مزدوروں اور کسانوں کو پابندِ سلاسل کیا۔ سوشلزم کے حامیوں اور جمہوریت پسندوں کو زنداں میں ڈالا۔ مزدوروں اور کسانوں پر شر پسندی اور ملک دشمنی کا الزام لگا کر ان کی تحریک کو لاٹھیوں، گولیوں اور کوڑوں سے ختم کرنے کی کوشش کی۔ اس لئے ہم یحییٰ خان کے دورِ حکومت کو بھی ایوبی آمریت کا ایک حصّہ کہتے ہیں۔

ڈاکٹر رشید نے کہا کہ "دسمبر ۱۹۷۰ء کے انتخابات کے بعد یحییٰ خان نے اپنا اقتدار برقرار رکھنے کے لئے مشرقی پاکستان میں "سیاسی ڈرامہ" رچایا۔ جب مشرقی پاکستان میں فوجی کارروائی کی گئی۔ تو نیشنل اسٹوڈنٹس فیڈریشن نے اِسے غلط اور ملک دشمن اقدام قرار دیا۔ این۔ ایس۔ ایف نے اس مسئلہ پر دوٹوک اور واضح موقف اختیار کیا۔ این۔ ایس۔ ایف کا ایک گروہ یحییٰ خان کے اقدام کا حامی تھا۔ چنانچہ ہم نے اِس کی مخالفت کی۔ این۔ ایس۔ ایف کے اس مخصوص گروہ کے علاوہ ملک کے نام نہاد بائیں بازو کے سیاست دان بھی فوجی کارروائی اور یحییٰ خان کے اقدام کے حامی تھے۔ ان عناصر نے "عوام دوستی" کے لبادے میں عوام دشمنی کا ثبوت دیا اور اعلانیہ فوجی جنتا کی حمایت کی۔

انہوں نے پُرزور الفاظ میں کہا کہ مشرقی پاکستان میں فوجی جنتا کی شکست یحییٰ خان کی شکست نہیں، ایک شخصیت کی شکست نہیں بلکہ پورے استحصالی نظام کی شکست ہے۔ شراب، زنا کو شکست کی وجہ بتانا اور اصل حقائق سے انحراف ہے۔ اور اس استحصالی نظام کو سہارا دینے کے مترادف ہے۔ مشرقی پاکستان میں فوجی ٹولے کی شکست کی اصل وجہ عوامی استحصال، بھوک، ناداری، افلاس اور بیماری ہے۔ بھوکی اور افلاس زدہ قوم کس طرح دشمن سے مقابلہ کر سکتی ہے؟ بیرونی جارحیت کا کیوں کر مقابلہ کر سکتی ہے۔؟ تین کروڑ ویت نامی عوام دورِ جدید کی سب سے بڑی طاقت اور عالمی سامراج امریکہ سے نبرد آزما ہیں۔ اور اُسے شکست پر شکست دے رہے ہیں۔ ان کی کامیابی کی واحد وجہ یہ ہے کہ شمالی ویت نام میں نظام تبدیل ہو چکا ہے۔ عوام کو آزادی حاصل ہے۔ معاشی اور سیاسی آزادی، ان کا استحصال نہیں کیا جاتا۔ ڈاکٹر رشید نے کہا کہ جب استحصالی طبقوں کو یہ خطرہ پیدا ہوا کہ فوجی ٹولے کے خلاف عوام کی بغاوت اور نفرت پورے نظام اور استحصالی طبقات کے خلاف بغاوت میں تبدیل ہو جائے گی تو استحصالی طبقوں نے عوام کے غصّے اور نفرت سے بچنے کے لئے موجودہ حکومت قائم کر دی۔

ڈاکٹر رشید نے بعض صنعتوں کو سرکاری تحویل میں لینے کے اقدام کو ناکافی قرار دیتے ہوئے کہا کہ اس سے عوام کو کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ اس اقدام کو "قومیانہ" نہیں کہا جا سکتا۔ کیونکہ سرمایہ دار اب بھی منافع کے مستحق قرار دیئے گیے ہیں۔ تمام صنعتوں کو بلا معاوضہ قومی ملکیت میں لے لیا جائے۔ کیونکہ یہ سرمایہ دار ۲۴ سال میں عوام کا کافی استحصال کر چکے ہیں اور اصل سے کئی گنا زیادہ منافع حاصل کر چکے ہیں۔ ان صنعتوں کو نوکر شاہی کے کل پرزوں کے حوالے کرنے کے بجائے مزدوروں کے سپرد کیا جائے اور کنٹرول کمیٹیاں قائم کی جائیں۔ انہوں نے کہا کہ اگر حکومت تیس خاندانوں کی تمام دولت ضبط کر لے تو اسے غیر ملکی امداد اور قرضوں کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔

داؤد، ولیکا اور جنرل حبیب اللہ کی رہائی پر ڈاکٹر رشید حسن خان نے نکتہ چینی کرتے ہوئے کہا کہ پہلے انہیں گرفتار کیا گیا اور پھر کوئی سزا دیئے بغیر چھوڑ دیا۔ حکومت کے اس اقدام سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ سرمایہ داروں اور عوام دونوں کو خوش رکھنے کی پالیسی پر عمل کر رہی ہے لیکن اب یہ پالیسی کامیاب نہیں ہو سکتی۔ یہ ۱۹۴۷ء یا ۱۹۵۸ء نہیں بلکہ ۱۹۷۲ء ہے۔ اب حکومت کو دوٹوک اور واضح فیصلہ کرنا ہوگا کہ وہ کس کے ساتھ ہے استحصالی

طبقوں کے ساتھ یا عوام کے ساتھ۔

حکومت کی خارجہ پالیسی پر کڑی نکتہ چینی کرتے ہوئے ڈاکٹر رشید حسن خان نے کہا کہ امریکی سامراج نے ۱۹۶۵ء میں فوجی سامان کی ترسیل روک دی۔ سیٹو اور سینٹو خاموش اور بے عمل رہے۔ حالیہ جنگ میں بھی امریکی سامراج نے درپردہ بھارت کی مدد کی لیکن حکومت اب بھی سیٹو سنٹو کے رویّہ پر نظرثانی کرنے کی بات کر رہی ہے۔ اسی طرح حکومت سوویٹ یونین کو "اپنا دوست" کہہ رہی ہے حالانکہ اس نے اعلانیہ بھارتی جارحیت کا ساتھ دیا اور اب "بنگلہ دیش" کو بھی تسلیم کر لیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہو سکتا ہے کہ حکومت دوست اور دشمن میں تمیز نہ کر سکتی ہو مگر پاکستانی عوام بخوبی جانتے ہیں کہ ان کے دوست کون ہیں اور دشمن کون؟ ہمارا واحد مخلص دوست عوامی جمہوریہ چین ہے۔

انہوں نے عوام کو مشورہ دیا کہ وہ خوش فہمی میں مبتلا نہ ہوں کیونکہ یہ عوام کی منزل نہیں ہے۔ عوام کو چاہیئے کہ وہ اپنی جدوجہد برقرار رکھیں اور عوامی جمہوریت کے قیام کے لیے انقلابی جدوجہد کرتے رہیں۔ انہوں نے بورژوا جمہوریت پر اپنے عدم اعتماد کا اظہار کیا اور تمام کالے قوانین فوراً منسوخ کرنے کا مطالبہ کیا کہ عوام کو تحریر و تقریر کی مکمل آزادی دی جائے انہوں نے ملک میں انقلابی زرعی اصلاحات کی ضرورت پر زور دیا اور کہا کہ تمام زمینیں کسانوں کے حوالے کر دی جائیں۔ انہوں نے یہ بھی مطالبہ کیا کہ جن فوجی افسروں کو زمینیں دی گئی ہیں وہ واپس لی جائیں۔

انہوں نے یہ بھی مطالبہ کیا کہ تمام غیرملکی قرضوں کو ساقط کر دیا جائے۔ ڈاکٹر رشید حسن خان نے کہا کہ حکومت کی جانب سے بار بار کہا جا رہا ہے کہ خزانہ خالی ہے لیکن اُسے پُر کرنے کے لیے کوئی اقدام نہیں کیا گیا۔ اگر غیرملکی قرضوں کو منسوخ کر دیا جائے اور سرمایہ داروں کے مفادات کو ضبط کر لیا جائے تو خزانہ بھر سکتا ہے۔ انہوں نے صوبوں کو مکمل صوبائی خودمختاری دینے پر زور دیتے ہوئے کہا کہ صوبائی خودمختاری نہ دینے کی وجہ سے پاکستان کو مشرقی پاکستان سے ہاتھ دھونے پڑے ہیں۔ اگر صوبائی خودمختاری نہ دی گئی تو "نئے مجیب الرحمٰن پیدا ہوں گے اور نئے بنگلہ دیش بنیں گے"۔

انہوں نے فوج کی موجودہ تنظیم پر بھی نکتہ چینی کرتے ہوئے مطالبہ کیا کہ فوج میں طبقاتی طرز کا نظام ختم کیا جائے ڈاکٹر رشید حسن خان نے یہ بھی مطالبہ کیا کہ تین سو روپے ماہانہ آمدنی والے لوگوں کے بچوّں کو یونیورسٹی تک تعلیم مفت

باقی صفحہ ۳۴ پر ملاحظہ فرمائیں

جاگیردار نے پیپلز پارٹی کے رہنماؤں کو

برہنہ کر کے جلوس نکالا، سربازار جُوتے لگوائے

طارق سعید

سرحد کے ہشت نگر کی طرح پنجاب میں بھی ایک ہشت نگر ہے۔ اگر اُسے آزاد ریاست کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ اس ریاست کا مالک ایک بڑا جاگیردار ہے جو اپنے علاقے کا مشہور پیر بھی ہے وہ اپنی ۲۵ مربع اراضی کے علاوہ ہزاروں روپے دربار قطبیہ چشتیہ سے نذرانے کی صُورت میں وصول کرتا ہے۔ اس طرح وہ لکھ پتی ہے۔ ریاست کا نام سندھیلیانوالی ہے جو تحصیل ٹوبہ ٹیک سنگھ ضلع لائلپور میں پیر محل سے گیارہ میل مغرب کی طرف واقع ہے۔ یہ سارا قصبہ چُونکہ پیر اسرار حسین شاہ کی اراضی میں شمار ہوتا ہے لہٰذا اس قصبہ یا ریاست کے تمام باشندے پیر اسرار حسین شاہ کے غلام ہیں۔ یہ تمام مزارعے، دکاندار اور مزدور پیر صاحب کی مرضی کے خلاف کوئی کام نہیں کر سکتے۔ اس قصبہ میں کسی خاندان کی عزت محفوظ نہیں ہے سُنا ہے کہ پیر صاحب کی کوٹھی کے نیچے ایک تہہ خانہ ہے جس میں ایک خاص کمرہ پیر صاحب کے لئے مخصوص ہے۔ پیر صاحب کے اس شبستاں کے در و دیوار سے نہ جانے کتنی معصوم کنواریوں کی المناک داستانیں وابستہ ہیں

انتخابات میں کچھ لوگوں نے پیر صاحب سے بغاوت کرنی چاہی اور پیپلز پارٹی کے لئے کام کرنا چاہا تو پیر صاحب کے غنڈوں نے مار مار کر اُنھیں قصبے سے باہر نکال دیا۔ انھیں دکانوں سے بے دخل کر دیا لیکن انتخابات میں پیپلز پارٹی نے زبردست کامیابی حاصل کی تو جن لوگوں پر پیر صاحب کو شک گزرا کہ انہوں نے پیپلز پارٹی کو ووٹ دیتے ہیں، اُن کو ننگا کر کے پیر صاحب کے غنڈوں نے پُورے شہر میں پھیرایا، ہر دسویں قدم پر اُن کی پیٹھ پر جُوتے مارے۔ پھر انہیں دوکانوں اور زمینوں سے بے دخل کر کے شہر بدر کر دیا گیا۔

چند روز کی بات ہے کہ حبیب اللہ نیازی نامی ایک شخص نے سندھیلیانوالی میں پیپلز پارٹی کا دفتر قائم کیا اور اپنی دوکان کے اُوپر پیپلز پارٹی کا جھنڈا لہرا دیا۔ جب پیر صاحب کے غنڈوں کو پتہ چلا تو انہوں نے نیازی کی دکان کو سربمہر کر دیا۔ جھنڈا اتار کر دیا۔ جھنڈا اتار کر تار تار کر دیا۔ بعد میں اُس کے مکان کے گرد گھیرا ڈال لیا اور اسے قتل کرنا چاہا حبیب نیازی کو اس کا علم ہُوا تو بے چارا عورتوں کے بھیس میں دیوار پھاند کر فرار ہوگیا۔ ساری رات اُس نے کھیتوں میں بسر کی۔ اسی رات پارٹی کے نائب صدر غلام فرید کی بیوی اور دو بچیوں کو بھی اغوا کر لیا گیا ہے جو تادمِ تحریر نہیں مل سکیں۔ کئی دوکانداروں کو جنہوں نے پیپلز پارٹی کے دفتر قائم کرنے میں حبیب اللہ نیازی کی حمایت کی تھی۔ دوکانوں سے بے دخل کر دیئے گئے اور دوکانوں کو سربمہر کر دیا گیا۔ جن لوگوں کو شہر سے نکال دیا۔ ان کے کئی بچوں کے متعلق کوئی پتہ نہیں لگ سکا۔

اسی دوران ایک دن چوہدری محمد اسلم ایم این اے اور پیپلز پارٹی کے دوسرے رہنما سندھیلیانوالی کے دورے پر گئے تو مسلح غنڈوں نے اُن کی کار کو گھیر لیا اور قتل کرنا چاہا۔ لیکن ڈرائیور کی پھُرتی سے کار اُن کے گھیرے سے نکل گئی۔ اسی دن جب چودھری اسلم ایم این اے بازار میں گئے تو پیر اسرار حسین کے اسسٹنٹ مینجر ور حسین شاہ نے للکارا اور کہا "اگر عزت چاہتے ہو تو فوراً واپس چلے جاؤ ورنہ تماشہ بنا دیا جائیگا" اس کے بعد اُس نے انھیں چیخ چیخ کر گندی گندی گالیاں دیں۔ بڑی مشکل سے پیپلز پارٹی کے رہنما بچ کر نکلے

پیر محل تھانہ میں پیر اسرار حسین شاہ کے خلاف درجنوں رپورٹیں درج ہیں لیکن تا حال کوئی کارروائی عمل میں نہیں آئی۔ باخبر حلقوں کے مطابق سرگودھا ڈویژن کا ڈی آئی جی پولیس پیر اسرار حسین شاہ کی مبینہ طور پر پشت پناہی کرتا ہے

کھیل

اس کی محبت ٹوکیو کی رنگین فضا میں پروان چڑھی

کھیل کے یحییٰ خانوں کا بھی حساب چکایا جائے

لطافت علی صدیقی

ان دنوں مجھے کھیل کے نئے وڈیروں کے خلاف لاتعداد خطوط اور ٹیلی فون موصول ہو رہے ہیں۔ کہ ان کی نقاب کشائی کی جائے۔ ان کے سیاہ کارناموں سے پردہ ہٹایا جائے۔ اس کے بارے میں مجھے صرف اتنا کہنا ہے کہ ایسے تمام وڈیرے پی پی پی کے رہنما مسٹر عبدالحفیظ پگبول کے حوالے کردیے گئے ہیں۔ ان کے بارے میں وہی فیصلہ کریں گے، اور اُن کا فیصلہ یقیناً کھیل اور قومی مفاد میں ہوگا۔ انہوں نے قوم سے وعدہ کیا ہے کہ "کھیل کے وڈیرے" اپنے آپ کو سزا سے نہ بچا سکیں۔" پیپلز پارٹی کی حکومت نے برّی اور بحری افواج کے چند موٹے اور بھدے فوجی وڈیروں کو تو عزت وآبرو سے ریٹائر کر دیا۔ مگر کھیل کے وڈیروں کے ساتھ ایسا حسن سلوک نہیں کیا جائیگا۔

- کرنل اے۔ آئی۔ ایس دارا کو پچاس غیر ملکی دوروں کا حساب دینا ہوگا۔
- مسٹر نقی بٹ کو تمام ان فنڈوں کا اکاؤنٹ دینا ہوگا جنہیں مبینہ طور پر خرد برد کر دیا گیا۔
- اتھلیٹکس وڈیرے مسٹر ابوالحسن کو بتانا ہوگا کہ انہوں نے گزشتہ سال چین، بنکاک، ایران اور سکاٹ لینڈ کا دورہ کس طرح کیا اور اس کے لئے کیا ذرائع استعمال کئے گئے۔
- کھیل کے ایک بڑے وڈیرے کو بہت جلد اپنی محبت کی کہانی سے پردہ اٹھانا ہوگا۔ جو ٹوکیو کی رنگین فضا میں پروان چڑھی تھی۔ اگر اس معاملے کی تھوڑی سی تفصیل بتا دوں، تو قارئین الفتح یقیناً محظوظ ہوں گے۔ ٹوکیو کے دورے میں پاکستان کی ہاکی ٹیم ہار گئی۔ یہ شکست بھارت سے ہوئی تھی۔ عالمی ٹائٹل سے ہاتھ دھونا پڑا۔ کھلاڑی شکستہ دل، سر جھکائے ہوئے پاکستان واپس آئے۔ لیکن مذکورہ وڈیرے پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ اپنے ہمراہ ایک حسین دوست لے کر آئے۔ اس کی بیوی اس حادثے پر بھونچکا رہ گئی اور پریشانی کے عالم میں گھر چھوڑنے پر مجبور ہوئی۔

اسپورٹس کا یہ وڈیرہ اپنے دور کا یحییٰ خان ثابت ہوا ہے۔ اس سے پوچھا جائے گا کہ جس لڑکی سے موصوف نے ۱۹۶۴ء میں راہ ورسم بڑھائی۔ اُس سے کتنے سالوں بعد شادی کی۔ اگر کھیل کے ایسے یحییٰ خانوں نے خاموشی سے اپنے آپ کو علیحدہ نہ کیا تو مجبوراً مجھے ٹوکیو افیئر زیر قلم اٹھانا پڑے گا۔

کراچی کے وڈیروں کے گروپ کو بتانا ہوگا کہ بوگس سندھ اولمپک ایسوسی ایشن کا دفتر کہاں ہے۔؟ ایسوسی ایشن کو باکسنگ کے وڈیروں کی جیب سے باہر نکالنا ہوگا۔

ہمیں خوشی ہے کہ مسٹر عبدالستار گبول کو پاکستان فٹ بال فیڈریشن کا صدر منتخب کیا گیا۔ مسٹر گبول فٹ بال کے ایک منجھے ہوئے کھلاڑی رہ چکے ہیں۔ وہ لیاری کی آواز کہے جاتے ہیں۔ لیاری فٹ بال کے کھیل کا گڑھ اور اچھے کھلاڑیوں کا سرچشمہ ہے۔ اس جگہ سے تراب، عمر اور حسین جیسے عظیم کھلاڑی پیدا ہوئے۔ فٹ بال فیڈریشن اور کراچی فٹ بال ایسوسی ایشن نے ان کھلاڑیوں کا استحصال کیا۔ سابق کھلاڑی تراب علی کو ٹیکسی چلانے پر مجبور کر دیا گیا۔ یہ فٹ بال کے کیپٹن رہ چکے ہیں۔ دوسرے سابق کپتان مسٹر عمر کراچی میونسپل کارپوریشن میں معمولی تنخواہ پر ملازمت کرتے ہیں۔

ان عظیم کھلاڑیوں کی مالی امداد کے لئے آج تک کچھ نہیں کیا گیا۔ اُن کی وجہ سے فٹ بال کا کھیل مقبول ہوا اور ملک کا سر بلند ہوا۔ مگر کھیل کے وڈیرے اپنا گھر بھرتے رہے، اور ان کی جھولی کو خالی رکھا۔ مسٹر ستار گبول نے وعدہ نہیں اعلان کیا ہے کہ فٹ بال کے ضرورت مند کھلاڑیوں کی امداد کے لئے فنڈ کھولے جائیں گے۔

میجر نواز شہید

یہ اندوہناک خبر سننے میں آئی کہ میجر نواز نے پاک بھارت جنگ کے دوران چھمب، جوڑیاں سیکٹر میں بھارتی فوجیوں سے لڑتے ہوئے جام شہادت نوش کیا۔ شہید کو ستارۂ جرأت سے نواز اگ[...] نوجوان، خوب صورت اور اسمارٹ میجر نواز باکسنگ کے کوچ[...] تھے۔ انہیں باکسنگ کوچ سے محض اس جُرم میں علیحدہ کر دیا گیا[...] مرحوم نے باکسنگ کے وڈیروں کی مخالفت مول لی تھی۔ وہ [...] کہتے تھے۔ "یہ وڈیرے ایک دن یقیناً کیفرِ کردار کو پہنچیں گے۔" کاش آج میجر اپنے خواب کو عملی صورت میں دیکھنے کے [...] زندہ ہوتے۔

اے شہید تم نے ایک عظیم مقصد کے لئے قربانی دی۔ [...] تمہیں سلام کرتے ہیں۔

بقیہ : محنت کشوں کی سیاست

جا سکتا ہے جو کالجوں کی سیاست میں الجھنے اور بورژوا [...] پارٹیوں کی ذیلی طالب علم تنظیموں کو چلانے کے بجائے عملی [...] طور پر کسانوں اور مزدوروں کو اپنا رہنما اور اُستاد تسلیم ک[...] اور ان سے انقلابی شعور حاصل کرے۔ دیہات میں کسا[...] اور شہروں میں مزدوروں کے ساتھ گھل مل کر ان میں انقلا[...] سیاسی نظریات کا پراپیگنڈہ کرے اور محنت کشوں کی [...] طبقاتی جدوجہد میں شریک ہو۔ ہمارے طالب علموں [...] کو اس سلسلے میں چین کے ریڈ گارڈز اور انقلابی طلبا[...] کے نقش قدم پر چلنا چاہیئے جو تعلیم حاصل کرنے کے بع[...] اچھے عہدے حاصل کرنے کے بجائے دیہات میں کسان[...] کھیت مزدور اور گلہ بان کی حیثیت سے چینی عوام کی تم[...] انقلابی جدوجہد میں حصے رہے ہیں اور چیئرمین ماؤ[...] انقلابی جدوجہد میں حصہ لے رہے ہیں اور چیئرمین ماؤ کی ہدایت [...] کے مطابق چند مہینوں یا سالوں کے لیے نہیں بلکہ ہمیشہ [...] کے لیے مستقلاً دیہات میں آباد ہو چکے ہیں۔

الفتح

اخباری وڈیروں نے صحافت اور جمہوریت کے قاتل کو "شہید صحافت" بنا دیا • صفحہ ۴ سے آگے

کیا گیا تھا۔ بنگالی اور غیر بنگالی کا اختلاف پیدا کرایا گیا تھا یہ پوسٹر اور ہینڈ بل بنگلہ زبان میں چھپے ہوئے ہوتے۔ انہیں جگہ جگہ دیواروں پر چسپاں کیا جاتا۔ عوام میں تقسیم کیا جاتا۔ اس سازش میں جماعت اسلامی برابر کی شریک تھی۔ اس نے انتشار اور بے چینی پھیلانے میں رضوی کی طرح سے مدد کی۔ غرضیکہ جب انتشار پوری طرح پھیل گیا۔ قانون کی حکمرانی ختم ہوگئی تو پروگرام کے مطابق مشرقی پاکستان میں فوجی کارروائی کا خفیہ منصوبہ بنایا گیا جو ڈھاکہ میں ۱۴ مارچ ۱۹۷۱ء کو تیار کیا گیا۔

الطاف گوہر جس خطرناک منصوبے میں ایک اہم کردار کر رہے تھے۔ وہ مشرقی پاکستان میں فوجی کارروائی کے بعد کسی حد تک تعطل کا شکار ہو گیا اس لیے کہ یحییٰ خان اس وقت جماعت اسلامی اور دائیں بازو کی دوسری جماعتوں سے گٹھ جوڑ کر چکے تھے۔ اور ان کی امداد اور تعاون سے بنگالیوں کی سیاسی امنگوں کو تشدد سے دبا دینا چاہتے تھے۔

بتایا جاتا ہے کہ جنگ دسمبر ۱۹۷۱ء کے آخری دنوں میں اس خطرناک منصوبے کے تحت ایک بار پھر یحییٰ خان کے ساتھ سازباز کی گئی۔ یہ وقت وہ تھا جب یحییٰ خان جنگ کی صورت حال سے بہت پریشان تھے۔ امریکہ جنگ کا دائرہ پھیلانے سے گریز کر رہا تھا۔ روس کا دباؤ شدید سے شدید تر ہوتا جا رہا تھا۔ چنانچہ بعض اطلاعات کے مطابق یہ طے کیا گیا کہ ذوالفقار علی بھٹو کو قتل کرا دیا جائے یا گرفتار کر لیا جائے۔ پیپلز پارٹی کو غیر قانونی قرار دے دیا جائے۔ اور چین کے حامی محب وطن عناصر کو تشدد کے ذریعے کچل دیا جائے۔ مگر صورت احوال نے اچانک اتنی تیزی سے پلٹا کھایا کہ حالات یحییٰ خان کے قابو میں نہ رہے۔ ملک میں خانہ جنگی کی صورت پیدا ہو گئی۔ چنانچہ یہ کوشش بھی ناکام ہوئی اور اقتدار پیپلز پارٹی کے ہاتھ میں آ گیا۔

اقتدار پیپلز پارٹی کے ہاتھ میں آ جانے کے بعد اس خطرناک منصوبے کے تیسرے مرحلے پر کام شروع کیا گیا اس مرحلے کے لیے یہ پروگرام بنایا گیا کہ مغربی پاکستان میں بھی مشرقی پاکستان کی طرح سیاسی انتشار، بے چینی اور افراتفری پیدا کر کے لاقانونیت پھیلائی جائے۔ اس طرح حکومت پر اس قدر شدید دباؤ ڈالا جائے کہ وہ روس کے سامنے گھٹنے ٹیک دے اور چین سے تعلقات توڑ کر بھارت کے ساتھ ایک دست نگر ریاست کی حیثیت سے کنفیڈریشن بنائے۔ اگر سیاسی دباؤ سے یہ مقصد حاصل نہ ہو تو بصورت دیگر سیاسی جوڑ توڑ سے حکومت کا تختہ الٹ دیا جائے۔ باخبر سیاسی حلقوں کا خیال ہے کہ اس خطرناک منصوبے میں بعض سیاسی رہنماؤں کا قتل بھی شامل تھا۔ توقع ہے کہ اس سلسلے میں عنقریب کچھ اور بھی گرفتاریاں عمل میں آئیں گی۔

معلوم ہوا ہے کہ الطاف گوہر شروع ہی سے اس خطرناک منصوبے میں شامل تھے۔ ایوب خان سے وفاداری کے نتیجے میں وہ پیپلز پارٹی کے سخت مخالف ہیں۔ ان کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ قیام پاکستان سے قبل وہ آل انڈیا ریڈیو میں پروگرام اسسٹنٹ تھے۔ دوسری عالمی جنگ کے دوران وہ ملٹری اکاؤنٹ سروس میں شامل ہو گئے۔ پاکستان بننے کے بعد وہ وزارت خزانہ سے وابستہ تھے۔ ان پر چوہدری محمد علی بطور خاص مہربان تھے۔ لہٰذا ان کی سفارش پر غلام محمد مرحوم نے انہیں سی ایس پی نامزد کر دیا پاکستان کی سیاسی زندگی میں وہ اس وقت منظر عام پر آئے جب انہیں مرکزی سیکرٹری اطلاعات مقرر کیا گیا۔ یہ نومبر ۱۹۶۴ء کا ذکر ہے۔ اس وقت پاکستان پر چین کے ساتھ بڑھتے ہوئے تعلقات کے باعث امریکہ زبردست سیاسی دباؤ ڈال رہا تھا۔ پاکستان کی فوجی اور اقتصادی امداد بند کی جا چکی تھی۔ اسی زمانے میں امریکی صدر جانسن کے خصوصی نمائندے جارج بال پاکستان آئے۔ دوسرے مطالبات کے ساتھ ان کا ایک مطالبہ یہ بھی تھا کہ قدرت اللہ شہاب کو سیکرٹری اطلاعات کے عہدے سے ہٹا دیا جائے۔ امریکہ کا خیال تھا کہ قدرت اللہ شہاب پاکستانی اخبارات کے ذریعے امریکہ کے خلاف پراپیگنڈا پھیلا کر چین کے لیے عوام میں ہمدردی اور محبت کے جذبات کو فروغ دے رہے ہیں ایوب خان امریکی دباؤ میں آ گئے اور شہاب کو جلاوطن کر کے ہالینڈ میں سفیر بنا دیا گیا۔ الطاف گوہر ان دنوں کسی خاص مشن پر امریکہ میں مقیم تھے۔ انہیں بڑے پراسرار حالات میں پاکستان واپس بلا کر وزارت اطلاعات کا سیکرٹری بنا دیا گیا۔ حالانکہ وہ اس وقت جوائنٹ سیکرٹری تھے۔ اور اتنے جونیئر تھے کہ ان کے سیکرٹری بننے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ لیکن ایوب خان نے اپنے خصوصی اختیارات سے انہیں ترقی دے کر سیکرٹری کے عہدے پر فائز کر دیا۔

سیکرٹری اطلاعات بن جانے کے بعد الطاف گوہر ایوب خان کے قریب سے قریب تر ہوتے گئے حتیٰ کہ انہوں نے ملک کی سیاست میں براہ راست حصہ لینا شروع کر دیا۔

ایوب خان کے دور میں جو محلاتی سازشیں ہوتیں ان میں الطاف گوہر اہم کردار ادا کرتے۔ وہ سیاسی دھڑے بنواتے پھر ان میں انتشار پیدا کرواتے۔ کسی کو آگے لاتے اور کسی کو پس منظر میں لے جاتے۔ اس سیاسی شعبدہ گری میں وہ ایوب خان کے ساتھ نہایت وفاداری سے خدمات انجام دیتے رہے۔ اس دور میں جمہوریت کا جس طرح قتل ہوا اس میں ایوب خان کے ساتھ الطاف گوہر برابر شریک ہے مشہور ہے کہ عوامی لیگ کے چھ نکات کے مصنف بھی الطاف گوہر ہی ہیں۔ پس منظر اس کا یہ بیان کیا جاتا ہے کہ جب ایوب حکومت کے خلاف حزب اختلاف کی تمام سیاسی جماعتوں نے قومی جمہوری محاذ قائم کرنا چاہا تو ایوب خان سخت پریشان ہوئے۔ وہ یہ ہرگز نہ چاہتے تھے کہ پنجاب اور بنگال متحد ہو جائیں۔ چنانچہ الطاف گوہر نے مشرقی پاکستان کے سابق جگتو فرنٹ کے ۲۳ نکات کی روشنی میں چھ نکات کا فارمولا تیار کیا اور اسے لے کر شیخ مجیب کے پاس ڈھاکہ گئے۔ انہیں اس طرح شیشے میں اتارا کہ چھ نکات کو انہوں نے عوامی لیگ کا سیاسی پروگرام بنا دیا۔ چنانچہ وہی ہوا جو ایوب خان اور الطاف گوہر چاہتے تھے۔ چھ نکات پر قومی متحدہ محاذ میں پھوٹ پڑ گئی عوامی لیگ اس میں شامل نہ ہو سکی۔ الطاف گوہر چونکہ خاصے عرصے تک اپنی ملازمت کے سلسلے میں مشرقی پاکستان میں رہ چکے ہیں لہٰذا وہ ایوب خان کے دور میں مشرقی پاکستان کی سیاست کے ماہر سمجھے جاتے تھے۔ وہ بنگالی سیاستدانوں میں مقررہ پروگرام کے مطابق اتحاد اور عدم اتحاد پیدا کراتے رہتے تھے۔ اس کام کے لیے مشرقی پاکستان میں انہوں نے اپنے اعتماد کے چند خاص لوگ پیدا کر لیے تھے۔ جن میں کئی "دانشور خواتین" بھی شامل تھیں۔ اس سلسلے میں رقیہ کبیر کا اسکینڈل خاصہ مشہور ہوا۔

کہا جاتا ہے کہ جب ۳۰۳ افسروں کے خلاف بدعنوانیوں کے الزام میں کارروائی کی گئی تو ایوب خان نے بہت کوشش کی کہ الطاف گوہر پر کوئی آنچ نہ آئے مگر "جنرل رانی" کی ضد رکاوٹ بن گئی۔ رانی الطاف گوہر کے حقیقی چچا راجہ غضنفر حسین جنجوعہ کی بیٹی ہے۔ الطاف گوہر کے ساتھ اس کے جھگڑے کی دو وجوہات بیان کی جاتی ہیں۔ پہلی وجہ یہ تھی کہ الطاف گوہر کے والد راجہ تفضل حسین جنجوعہ مرحوم جو ریلوے کے ٹھیکے دار تھے۔ شروع میں اس بات کے حامی تھے کہ رانی کی شادی گھر میں ہی ہو جائے گی مگر بعد میں وہ اپنے وعدے سے منحرف ہو گئے۔ دوسری وجہ

گجرات میں مشترکہ خاندانی جائیداد کا تنازعہ تھا جس پر عرصہ دراز تک دونوں بھائیوں میں مقدمہ بازی رہی اور جس نے آگے چل کر شدید دشمنی کی صورت اختیار کر لی۔

سرکاری ملازمت سے برطرف ہونے کے بعد الطاف گوہر قانونی پابندیوں کے باوجود چوری چھپے سیاست میں حصہ لیتے رہے۔ اس زمانے میں انہوں نے "عروسہ" کے نام سے ایک فرم قائم کی اور اس کی آڑ میں وہ مختلف سیاسی شخصیتوں سے ملتے جلتے رہے۔ اپنے سیاسی منصوبے کے لیے فضا ہموار کرتے رہے۔ ہارون برادرز سے یوں تو ان کی پہلے سے ملاقات تھی۔ مگر ملازمت سے برطرف ہونے کے بعد وہ ان کے بہت زیادہ قریب آ گئے۔ اس قریبی تعلق کی بنیادی کڑی خواجہ رحمٰن ہیں جو الطاف گوہر کے لڑکپن کے دوست ہیں۔ وہ ہارون انڈسٹریز میں ڈائرکٹر ہیں۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ محمود ہارون کی بیگم کے حقیقی بھائی ہیں۔ "لندن پلان"، جس کا ایک عرصہ تک چرچا رہا۔ بتایا جاتا ہے کہ اس میں خواجہ رحمٰن نے بڑا اہم کردار ادا کیا۔ ان دنوں وہ مہینہ میں کئی کئی بار کسی پُراسرار مشن پر لندن کے دورے کرتے تھے۔

بتایا جاتا ہے کہ طے شدہ پروگرام کے تحت محمود ہارون پہلے ہی لندن چلے گئے اور جب پیپلز پارٹی برسرِ اقتدار آئی تو اچانک ۲۴ دسمبر کو یہ اعلان شائع ہوا کہ الطاف گوہر "ڈان" کے چیف ایڈیٹر بنا دیئے گئے۔ صحافی حلقوں میں اس عجیب تقرر پر سخت حیرت کا اظہار کیا گیا۔ اس لئے کہ جمیل انصاری نہ صرف پاکستان کے ایک کہنہ مشق صحافی ہیں بلکہ گذشتہ کئی سال سے "ڈان" کے ایڈیٹر تھے۔ ان کی زیرِ ادارت اخبار خوش اسلوبی سے چل رہا تھا۔ پھر وہ کونسی وجوہ تھیں جن کے باعث الطاف گوہر کو ملک کے ایک بہت بڑے اخبار کا چیف ایڈیٹر مقرر کر دیا گیا۔ ایک ایسے شخص کو جس کا کبھی صحافت کے پیشے سے تعلق نہیں رہا۔ جس نے سالہا سال تک آزادیٔ صحافت کا گلا گھونٹا۔ رائے عامہ کو گمراہ کرنے اور ایوب خاں کی آمریت کو پائیدار بنانے کے لئے نیشنل پریس ٹرسٹ قائم کیا۔ ملک پر دستور زباں بندی نافذ کیا۔ نوکر شاہی کے اس بدنام کارندے کو آمریت کے اس آلۂ کار کو ایک ایسے وقت میں "ڈان" کا چیف ایڈیٹر مقرر کرنا جب ملک میں ۱۳ سالہ آمریت کے بعد جمہوریت بحال ہوئی تھی۔ سیاسی شعور رکھنے والے ہر شخص کے لئے حیرت کا باعث تھا

"ڈان" کی چیف ایڈیٹری محض ایک اہم دن تھی جس کے پیچھے الطاف گوہر ایک خطرناک سیاسی کھیل کھیل رہے تھے۔ بتایا جاتا ہے کہ چیف ایڈیٹر تو انھیں صرف اس لئے بنایا گیا تھا کہ اگر اُن کی سرگرمیاں بے نقاب ہو جائیں اور اُنھیں اس کی پاداش میں جیل جانا پڑے تو "آزادیٔ صحافت" کے نام پہ دہائی دی جائے گوہر کو "شہید صحافت" بنا کر اودھم مچایا جائے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ سب کچھ ایک سوچے سمجھے پروگرام کے تحت کیا گیا تھا۔ الطاف گوہر کو سندھ کلب کی اکثر نجی صحبتوں میں یہ کہتے سُنا گیا کہ "جیل جاؤں گا تو کم از کم اے کلاس تو ملے گی۔ میں نے ایک بستر بندھوا کر علیحدہ رکھ دیا ہے"

صحافت میں چور دروازے سے داخل ہونے کے بعد الطاف گوہر نے اپنی سرگرمیاں تیز کر دیں۔ جن دنوں اصغر خاں کراچی آئے تھے، گوہر اُن سے روزانہ ملتے۔ انھیں مشورے دیتے۔ اُن کے بیانات تیار کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ اصغر خاں کی کراچی میں پہلی پریس کانفرنس کو نہ صرف نہایت آب و تاب کے ساتھ 'ڈان' میں شائع کیا گیا بلکہ یہ خبر خود الطاف گوہر نے تیار کی تھی۔ جو باتیں خبر ایجنسی اور رپورٹر نے نہ بتائی تھیں۔ اس کا انہوں نے اضافہ کیا تھا۔ پھر اس پریس کانفرنس کی بنیاد پر انہوں نے لمبا چوڑا اداریہ بھی تحریر کیا۔ بلوچستان میں سیاسی بے چینی پھیلانے کے لئے وہ نواب اکبر خان بگٹی سے خفیہ ملاقاتیں کرتے نیپ کے رہنماؤں سے طویل مذاکرات کرتے۔ نیپ کے حامیوں کی "ڈان" کے لیے بھرتی کی گئی۔ مظہر علی خان کالم نویس مقرر ہوئے۔ عبداللہ ملک، حمید اختر اور سبطِ حسن کی قلمی معاونت "حریت" کے لئے حاصل کی گئی۔ وہ ان تمام سیاسی جماعتوں سے ساز باز کر رہے تھے۔ جو پیپلز پارٹی کی مخالف تھیں۔ عوامی جمہوریہ چین کی مخالف تھیں

کہا جاتا ہے صحافت سے براہِ راست تعلق رکھنے والی بعض اہم شخصیتوں سے اُن کا گہرا رابطہ تھا۔ ان کی خفیہ ملاقاتیں ہوتی تھیں۔ ان میں پی پی آئی کے معظم علی بھی شامل ہوتے تھے۔ روزنامہ "جنگ" کے میر خلیل الرحمٰن بھی شریک ہوتے تھے اور روزنامہ "سن" کے شمیم احمد بھی ان خفیہ ملاقاتوں میں آئندہ کے پروگرام بنتے حکومت کو ہدفِ تنقید بنانے کے منصوبے بنتے۔ یہ تو صحافت کی سطح پہ الطاف گوہر کی سرگرمیاں تھیں۔ اس کے علاوہ ان کی خفیہ ملاقاتیں پنجاب اور سندھ کے بعض بڑے جاگیرداروں اور سرمایہ داروں سے بھی ہوئیں جو مجوزہ زرعی اصلاحات اور صنعتوں کو قومی ملکیت قرار دیئے جانے

باقی صفحہ ۴۳ پر ملاحظہ فرمائیں

وزیر اعظم چو این لائی سے صدر بھٹو کی بات چیت : صفحہ ۶ سے آگے

جنگیں بڑے ملک آپس میں لڑ سکتے ہیں۔ چھوٹے ملک کا جب بڑے ملک سے مقابلہ ہو تو اُسے ہر طرح سے تیار رہنا چاہیئے اور زندگی موت کی جنگ لڑنا چاہیئے۔ باقاعدہ پیشہ ورانہ فوج کی بجائے عوام کو مسلّح کیجئے۔

مسلم ممالک کی قیادت

بین الاقوامی پالیسی میں انہوں نے کہا کہ مُسلم ممالک پاکستان کا ساتھ دے رہے ہیں۔ اِس لئے پاکستان کو چاہیئے کہ وہ مُسلم ممالک کی قیادت سنبھالتے ہوئے ان کے سامراج دشمن کردار کو مستحکم کرے۔ مُسلم ممالک متحد ہو کر پہلی بار روس اور امریکہ کے خلاف جذبات کا اظہار کر رہے ہیں۔ اِس لئے اس جذبے کو مستحکم کرنے کی ضرورت ہے۔ پاکستان مُسلم ممالک کی قیادت کرتے ہوئے مُسلم ممالک اور تیسری دنیا بالخصوص چین کے درمیان رابطہ بن سکتا ہے۔

بھارت۔ جنگی قیدی۔ بنگلہ دیش

۔۔رت کی توسیع پسندی، جنگی قیدیوں کی واپسی اور بنگلہ دیش کے سلسلے میں چین کا وہی موقف ہے۔ جو پاکستان کا موقف ہے۔ مگر ان کا مشورہ یہی ہے کہ بھارت جیسے مکار دشمن پر اگر کسی چیز کا بڑا اثر ہو سکتا ہے تو وہ متحد اور مستحکم پاکستانی قوم کی وحدت ہے۔ پاکستانی قوم یکجان اور یک خیال ہو جائے گی۔ مضبوط اور خوشحال ہو جائے گی تو بھارت پر دباؤ پڑے گا۔ اگر پاکستان میں انتشار رہا اور غریب بدحال رہے تو بھارت کو اپنی من مانی کا موقع ملتا رہے گا۔

یہ ہیں ہمارے موجودہ حالات اور یہ ہے چین کا دورہ۔

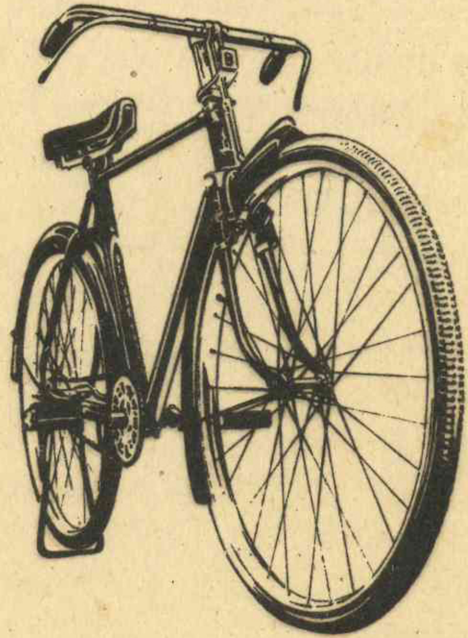
چین نے کوئی شرط عائد نہیں کی —— نہ یہ کہا کہ آپ کمیونسٹ بن جائیں۔ مذہب چھوڑ دیں، اسٹیٹس کو چھوڑ دیں۔ فلاں بلاک سے تعلقات رکھیں یا توڑ دیں۔ انہوں نے کھری کھری باتیں کی ہیں۔ اِس کے ساتھ قرضے معاف کر دیے ہیں۔ قرضوں کی ادائیگی کی میعاد بڑھا دی ہے۔ ہر قسم کی فوجی امداد دینے کا وعدہ کیا ہے۔ بحریہ کے کمانڈر انچیف اور ان کا وفد اس لئے وہاں ٹھہر بھی گیا ہے۔

چین نے سچے دوست کا کردار ادا کیا ہے۔ اب پاکستان کو اپنا کردار ادا کرنا ہے۔

بیکو

کی نئی انتظامیہ کی جانب سے بیکو بائیسکل
۱۹۷۲ کے ڈی لکس اور پاپولر ماڈلوں میں متعدد

نئے اضافے اور



نئے اضافے :
بائیسکل اسٹینڈ ۔ آرام دہ اور پائیدار ٹیری ٹاٹپ گدی
نئی خوبیاں :
زیادہ طاقتور بریک ۔ بہتر رِم ۔ مضبوط چمٹا ۔ پائیدار ہینڈل

قیمتوں میں بھی تخفیف کر دی گئی ہے



بیکو انڈسٹریز لمیٹڈ

نئی خوبیاں

بقیہ:- ظاہری خبریں اندرونی کہانیاں

کے سخت مخالف ہیں۔

معلوم ہوا ہے کہ الطاف گوہر کی گرفتاری سے ایوب خان کو سخت تشویش پیدا ہو گئی ہے لیکن بارون برادران پر الطاف گوہر کی گرفتاری سے کیا ردِعمل ہوا ہے۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ انہوں نے روس اور بھارت کے زبردست حامی اور نیپ کے دیرینہ رفیق منظر علی خان کو "ڈان" کا چیف ایڈیٹر مقرر کر دیا ہے۔ اور اس بے ضابطگی اور اپنی حق تلفی کے خلاف بطورِ احتجاج "ڈان" کے ایڈیٹر جمیل انصاری نے استعفےٰ دے دیا ہے۔ یہ تمام تقرریاں۔ یہ تمام تبدیلیاں جس منصوبے کے تحت کی جا رہی ہیں اس کے بارے میں بعض سنگین حقائق عنقریب سامنے آنے کی توقع ہے۔

بقیہ:- "تو بھٹو کی ہرگز نہ کرنا حمایت"

نے خود اپنی ایک تقریر میں علی الاعلان یہ بات کہی ہے کہ "شراب کو فوراً حرام قرار نہیں دیا جا سکتا"۔

اخبارات گواہ ہیں کہ ۷ رجنوری ۱۹۷۰ء کی شام کراچی کے آرٹلری میدان نمبر ایک کے جلسۂ عام سے خطاب کرتے ہوئے میاں طفیل محمد نے نہایت واشگاف الفاظ میں یہ کہا تھا۔

"یہ تصور غلط ہے کہ اسلام کو اچانک اور یک لخت نافذ کر دیا جائے گا بلکہ فطری تدریج کے ساتھ لوگوں کے سوچنے سمجھنے کے طریقوں میں تبدیلی کے بعد بعض بڑی تبدیلیاں لائی جائیں گی۔ دورِ رسالت میں بھی سود حضورؐ کی بعثت کے تقریباً بائیس برس بعد جا کر حرام کیا گیا۔ اور شراب کو بھی بتدریج حرام ٹھہرایا گیا"۔

میاں طفیل محمد کے اس بیان کے بعد پاکستان میں بھی شراب کو بتدریج حرام قرار دیا جا سکتا ہے اس کے لیے کوئی فوری مہم کی تو ضرورت نہیں ہے لیکن

خوئے بدرا بہانہ بسیار

اب شرارت کا بہانہ بنا کر ہر اسلام پسند دوسرے کو نصیحت کر رہا ہے کہ۔

اگر ملک ہاتھوں سے جاتا ہے جائے
تو بھٹو کی ہرگز نہ کرنا حمایت

کل شام ایک ایسے ہی خوئے بد والے بزرگ ایک محفل میں بھٹو کی بڑی برائیاں کر رہے تھے۔ کسی نے انھیں سمجھایا

"قبلہ۔ بھٹو جیسا کچھ بھی ہے۔ عوام کا منتخب اور چہیتا لیڈر ہے اور وہ بلاشبہ پاکستان کی آخری امید ہے۔ اگر اُسے خدانخواستہ کچھ ہو گیا تو یہ ملک انتشار، لاقانونی اور قتلِ عام کے بعد ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بھارت کے قدموں میں جا گرے گا"۔

دوسرے نے بڑے غصّے سے اس بزرگ سے پوچھا:

"قبلہ۔ آدھا ملک کھونے پر بھی آپ کو عقل نہیں آئی تو پھر کب آئے گی؟"

کسی ستم ظریف نے یہ سُن کر کہا:

"یار۔ ان کی عقل تو پُورا ملک کھونے پر بھی نہ آئے گی"۔

ستم ظریف تو یقیناً سچ کہتا ہے۔

بقیہ:- پرنس سہانوک

ہیں۔ ہم بھی اپنے اندرونی معاملات میں غیر ملکی مداخلت کی سختی سے مذمت کر رہے ہیں۔ اسی طرح ہم پاکستان کے اندرونی معاملات میں بھی غیر ملکی مداخلت کی شدید مذمت کرتے ہیں اور ہم صدر مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کے موقف کی تائید کرتے ہیں کہ ان کے اور شیخ مجیب الرحمان کے درمیان ملاقات کسی خارجی مداخلت اور دباؤ کے بغیر ہونی چاہیئے۔ میں پاکستان کے عظیم عوام کی حب الوطنی کا انتہائی مداح ہوں اور مجھے یقین ہے کہ پاکستان کے عوام اپنی سلامتی کی حفاظت کریں گے۔ ہمارے اور اُن کے مسائل ایک سے ہیں اگر کچھ دوسرے ملکوں کے لوگ ہم سے اختلاف بھی رکھتے ہیں۔ تو ہم ان کی مخالفت نہیں کرتے۔ کمبوڈیا اور پاکستان کے عوام ایک دوسرے کے جذبات کی قدر کرتے ہیں۔ کمبوڈیا کے عوام پاکستان کے عوام کے ان جذبات کے ممنون ہیں۔ جو انہوں نے کمبوڈیا کی تحریک آزادی کے حق میں ظاہر کئے ہیں۔ میں اپنے ہم وطنوں کی طرف سے اس بات پر زور دوں گا کہ پاکستان کے اندرونی مسائل کو حل کرنے کا حق صرف پاکستان کے عوام کو ہے۔ کسی دوسری طاقت کو اس میں مداخلت کرنے کا حق نہیں"۔

ہمارے ایک سوال کے جواب میں انہوں نے کہا کہ "لون نول کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ اس کے ساتھ اصل طاقت امریکہ کی ہے۔ امریکہ کی فوجی طاقت کا ہمیں مکمل احساس ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہمیں اپنے جذبۂ آزادی اور استقلال پر بھی یقین ہے۔ اس لئے فتح ہماری ہو گی"۔

پھر انہوں نے نقوی کے ایک سوال کے جواب میں کہا "ہماری جد و جہد جاری ہے۔ میرا خیال ہے کہ اگلے سال میں پنام پنہ میں ہوں گا اور پٹھو حکومت کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اور قومی شاہی حکومت اپنا جائز حق واپس لے لے گی"۔

اپنی بیگم کے بارے میں انہوں نے بتایا کہ "وہ صرف ایک بیوی نہیں بلکہ رفیق جد و جہد ہیں۔ وہ بھی آزادی کی جد و جہد میں میرے ساتھ ہیں۔ مشورے بھی دیتی ہیں اور عملی کام میں بھی حصّہ لے رہی ہیں"۔

پرنس کو بھی اور ہمیں بھی اب صدر بھٹو کی طرف سے دیئے گئے ظہرانے کے لئے گریٹ ہال میں پہنچنا تھا۔ اس لئے ہم نے اجازت چاہی۔ جاتے جاتے پرنس نے ہمیں اپنی ترتیب دی ہوئی موسیقی کے تین ریکارڈ تحفتہً دیئے۔ اور پھر ظہرانے کے بعد پرنس نے جاتے جاتے ہم سے خاص طور پر الوداعی مصافحہ کیا اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ "آپ جو کچھ لکھیں اس کے تراشے مجھے ضرور بھجوا دیں۔ کمبوڈیا کی جد و جہد میں اس سے یقیناً مدد ملے گی"۔

بقیہ:- ہنزہ سے چاٹگام تک

دی جائے، تعلیمی اخراجات کم کیے جائیں نئے تعلیمی ادارے کھولے جائیں تعلیمی نظام کو نئے خطوط پر استوار کیا جائے وائس چانسلر کا انتخاب اساتذہ اور طلباء کے ذریعے ہونا چاہیئے۔ یونیورسٹیوں کے چانسلر گورنروں کے بجائے ممتاز دانشوروں اور ماہرینِ تعلیم کو بنایا جائے۔ یونیورسٹی آرڈی ننس منسوخ کیا جائے طلباء کے لیے ٹرانسپورٹ کا بہتر انتظام کیا جائے۔ ڈاکٹر رشید حسن خان نے کہا کہ وہ ملک کے مسائل حل کرنے کے لیے دوسرے مظلوم طبقوں، مزدوروں اور کسانوں کے ساتھ تعاون کریں گے۔

بقیہ: اداریہ

اور ساہیوال کی سیاست کی کمان اپنے ہاتھ میں لینے سے گریز کریں۔ علاقائی دفاتر کے عہدے داروں کے بارے میں نامزدگیاں بند کی جائیں اور ہر عہدے دار کا انتخاب کرایا جائے۔

پاکستان پیپلز پارٹی کی جو شخصیات سیاسی تنظیم میں دلچسپی رکھتی ہیں۔ انہیں چیئرمین بھٹو حکومتی عہدوں سے الگ کر دیں اور ان سے تنظیمی کام لیں۔

الفتح کراچی

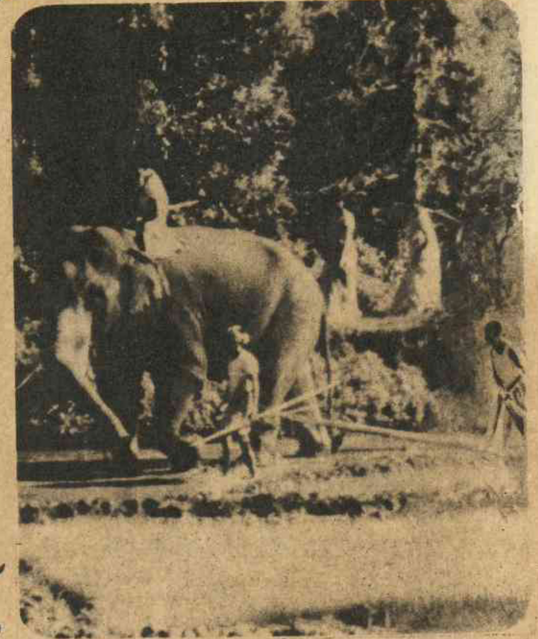
آئیے! پی آئی اے سے حسین و جمیل سرزمین





سیلون چلیں





کراچی سے پی آئی اے کے بوئنگ ہر بدھ اور جمعہ کو
صبح سویرے ۵ بجے کولمبو کیلئے
محوِ پرواز ہوتے ہیں جو صرف ساڑھے تین گھنٹے کی
مسافت پر ہے۔

اپنے دوست ملک کے سفر کیلئے پی آئی اے سے پرواز کیجئے
اور دورانِ پرواز ہماری پانچ ہزار سالہ مہمان نوازی
کا لطف اٹھایئے۔

PIA

پاکستان انٹرنیشنل ایئر لائنز

IAL-IPP-25/71-C

Regd No : S - 2772
Weekly "Al - Fatah" Karachi
10-17, FEBRUARY, 1972